جامعہ
The Monthly JAMIA
GOLDEN JUBILEE NUMBER
جشنِ زریں نمبر
جلد ۶۲
بابت نومبر سنہ ۱۹۷۰ء
شمارہ ۵

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر سید عابد حسین
ڈاکٹر سلامت اللہ ضیاء الحسن فاروقی

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

سرورق کی تصویر:

عمارت مدارس ثانوی و ابتدائی کا ایک حصہ

خط و کتابت کا پتہ
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

P. O. JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

اس شمارے کی قیمت
دو روپے

جلد ۶۲ | بابت نومبر ۱۹۷۰ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

تعلیمی ادارے

امیرِ جامعہ

شیخ الجامعہ

چند مرحوم اساتذہ

شذرات

آج ۲۹ اکتوبر ہے، آج ہی کے دن ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج (جواب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے) کی مسجد جامع میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مقدس ہاتھوں نے اس کی نیو رکھی تھی۔ اس واقعہ پر پچاس برس گزر گئے، اُس وقت کے جو لوگ ابھی باقی ہیں اور اُس موقع پر موجود تھے، انھیں تو یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہوگی، اور ویسے بھی قوموں کی زندگی میں پچاس برس کچھ زیادہ نہیں، بس سمجھ لیجیے کہ ایک لمحہ، لیکن کبھی کبھی ایک لمحہ بھی صدیوں پر بھاری ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کی یہ زندگی جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے، اسی طرح کا ایک لمحہ ہے جو اپنے اندر تعمیر و حسرتِ تعمیر، امیدوں اور ناامیدیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی ایک دنیا رکھتا ہے، کیسے کیسے پاک سیرت و پاک نظر انسان تھے جنھوں نے جامعہ کے سخت دنوں میں اسے زندہ رکھا، پھر قومی تعلیم کے کام کا ایک نقشہ بنایا اور لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا، انجذابِ توجہ و نظر کی یہ نوعیت ایسی تھی جیسے بوریہ نشین درویشوں کی طرف شاہوں اور منعموں کی احترام کی نظر اٹھتی ہے یا جیسے رات کا سناٹا ہو اور کہیں دور سے جرس کی آواز آ رہی ہو، اس آواز میں اتنی تاثیر ہو کہ لوگ دیر تک اسے سنتے رہیں اور محسوس کریں کہ یہ تو ان کے دلِ گم گشتہ ہی کی پکار ہے جو صحرا سے آ رہی ہے اور عزمِ سفر کی دعوت دے رہی ہے، کامل پچیس پچیس سال تک، جامعہ ملک کے سیاسی ہنگاموں سے الگ رہ کر (حالانکہ سیاست اور سیاست کاری کے اس دور میں کسی کے لیے اپنا دامن بچائے رکھنا بہت مشکل تھا) ایک ویرانے میں چمن بندی کرتی رہی، اس کا یہ کام چھوٹا ہے یا بڑا، اسے دیوانگی پر محمول کیا جائے یا فرزانگی کا ایک معجزہ تصور کیا جائے، یہ اربابِ نظر کا کام ہے کہ اسے کیا اہمیت دیتے ہیں۔

جامعہ والے بہ اتباعِ صحرا کا قانون رقم کرتے رہے، یا یوں کہیے کہ جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

لکھتے رہے اور اِس قبیلے کی آنکھ کا تارا وہ مردِ خدا تھا جس کی مدت العمر کی بے قراریوں کو ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو ہمیشہ کے لیے قرار آگیا اور جواب جامعہ ہی میں آسودۂ خاک ہے، ہماری مراد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے ہے جن سے اُسی ہفتے ہم لوگ جشنِ زرّیں کے سلسلے میں مشورہ لینے جانے والے تھے، اور اس بات پر بہت خوش تھے کہ اگرچہ جوہر و اجمل و انصاری، مولانا آزاد اور گاندھی جی اب ہم میں نہیں رہے لیکن کم از کم ایک شخص تو ہے جس کا شمار جامعہ کے بانیوں میں ہے اور جس کی زندگی کے بہترین ماہ و سال اس چمن کو اپنے خونِ جگر سے سینچنے میں صرف ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ذاکر صاحب نہ ہوتے تو شاید جامعہ کا قیام عمل میں نہ آتا، اور قائم ہو جانے کے بعد مرحوم نے اگر اپنی تمام ذہنی و روحانی صلاحیتوں کو اس کے لیے وقف نہ کر دیا ہوتا، تو غالباً آج یہ باقی نہ ہوتی۔ مبداءِ فیاض سے ذاکر صاحب کو بہت کچھ ملا تھا، انھوں نے وہ سب کچھ جامعہ کی نذر کر دیا اور آج اسی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ نگر کی تعلیمی بستی دنیا سے علم و ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے اور گو ذاکر صاحب نہیں ہیں لیکن ان کے افکار و خیالات زندہ رہیں گے اور جامعہ والوں کو ان سے انسپریشن ملتا رہے گا:

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں　　　رات دن گردش میں ہے رندوں کی بھری محفل میں ہے

آج ذاکر صاحب کے ساتھ ہمیں اُن کے اُن ساتھیوں کی خدمات بھی یاد آ رہی ہیں جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھنے اور تعلیم و تعلم اور علم و ادب کے میدان میں نئے تجربے اور نئی کاوشیں کرنے کی دُھن میں اپنے آرام و راحت کا خیال نہیں کیا، جن کے بیوی بچے اچھے کپڑے اور اچھی غذا کو ترستے رہے لیکن وہ خود قوم کے بچوں کی دیکھ بھال، اور تعلیم و تربیت میں لگے رہے، ہماری قوم میں اجتماعی طور پر تعلیمی کام کے لیے ایثار و قربانی، مسلسل برسوں، مشکلوں، تکلیفوں اور آزمائشوں کو جھیلنے کی مثالیں کم ملتی ہیں اور کیسے کہ پیشانی پر شکن نہیں، ہر وقت ایک پُر کیف سرمستی و سرشاری کی کیفیت، جو اچھے کام میں لگے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کے ان ساتھیوں میں ہر دور جبر،

ہر حیثیت اور ہر طرح کی صلاحیت کے لوگ تھے اور ہر شخص کا کام اپنی جگہ اہم اور ضروری تھا، ذاکر صاحب جامعہ کے سردار کی حیثیت سے سب کے دلوں میں اُمید اور یقین کی شمع روشن رکھتے، اور جب سب دیکھتے کہ ذاکر صاحب خود جو ایثار و قربانی، اخلاقی فضائل، ذہنی صلاحیت، خاندانی شرافت میں کسی سے کم نہیں ہیں، چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں تو ان کا یقین جامعہ کے بلند نصب العین پر اور بھی زیادہ پختہ اور ان کا عزم اس کے حصول کے لیے اور زیادہ مستحکم ہو جاتا۔ ایسے تمام لوگوں کا قوم پر احسان ہے اور قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی بے لوث خدمات کے سہارے جامعہ، باوجود صدہا دشواریوں کے، نہ صرف یہ کہ زندہ رہی بلکہ اس نے اپنے مختلف تعلیمی و علمی و ادبی کاموں سے ہندستان میں اور خاص طور سے مسلمانوں میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کی اور آج بھی "جاگو اور جگاؤ" کا یہ پیغمبرانہ کام صدقہ جاریہ کی طرح جاری ہے۔

جشنِ سیمیں (۱۹۴۶ء) کے موقع پر جن منصوبوں کو عمل میں لانے کا نقشہ پیش کیا گیا تھا ان میں سے کئی ایک عمل میں لائے گئے، البتہ کتبخانہ جامعہ کی عمارت اور مسجد ابھی تک نہیں بن سکی تھیں، علوم اسلامیہ کے تحقیقاتی ادارے "بیت الحکمت" کا کام آگے نہیں بڑھ سکا اور یہ خواب، خواب ہی رہا۔ جامعہ والوں کو ان تینوں منصوبوں کے ملتوی ہوتے رہنے سے سخت تشویش تھی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کتبخانہ علوم مشرقیہ کے نقطہ نظر سے ایک اہم اور بیش قیمت کتبخانہ ہے، کتابوں کی تعداد اس وقت تقریباً ساٹھ ہزار ہے اس میں جامعہ کالج، ٹیچرز کالج، رورل انسٹی ٹیوٹ اور مدارس کے کتب خانوں کی کتابیں شامل نہیں ہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس وقت جامعہ کے کتبخانے کی شاندار عمارت کا کافی حصہ بن چکا ہے اور دو تین مہینے میں کتابوں اور قدیم ادبی و علمی رسائل کا قیمتی ذخیرہ جو اس وقت کئی عمارتوں میں پھیلا ہوا ہے، اس نئی عمارت میں منتقل ہو کر یکجا ہو جائے گا اور اس کی افادیت بہت بڑھ جائے گی کہ اس سے بڑے پیمانے پر آسانی کے ساتھ، طلباء، اساتذہ اور ریسرچ اسکالر فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ مسجد بھی بن رہی ہے لیکن چونکہ اسے حکومت کے پیسے سے نہیں بلکہ قوم کے پیسے سے بننا ہے،

اس لیے اس کی تعمیر کی رفتار تیز نہیں ہے، اب تک اس پر تقریباً اسّی ہزار روپے خرچ ہو چکے ہیں، اس وقت کوئی بیس پچیس ہزار کی رقم موجود ہے لیکن جیسا کہ اخباروں میں اعلان کیا جا چکا ہے، اس پر پانچ لاکھ روپے صرف ہوں گے، سردست تو کم از کم پچاس ہزار روپے فوراً مطلوب ہیں تاکہ مسقف حصے کی چھت ڈالی جا سکے۔ خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ نیک کام پورا ہو کر رہے گا؛ کیا عجب کہ چند اشخاص غیب سے سامنے آجائیں اور جامعہ کی یہ آرزو، یہ خواب جلد ہی پورا ہو جائے۔

بیت الحکمت کا ذکر آتا ہے تو بے اختیار مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم یاد آجاتے ہیں اور اسی کے ساتھ اُس گہرے معنوی تعلق کے نقوش بھی اُبھر آتے ہیں جو جامعہ کو مولانا اور مولانا کے بزرگوں سے رہا ہے۔ چوبیس سال تک جلاوطنی کی زندگی گزار کر جب مولانا مرحوم وطن لوٹنے کی بابت سوچ رہے تھے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ جامعہ ملیہ ہی میں وہ آزاد رہ کر اپنے خیال کی اشاعت کر سکتے ہیں، چنانچہ انھوں نے ذاکر صاحب کو ایک خط لکھا، اپنے اصلاحی افکار و خیالات سے انھیں باخبر کیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر جامعہ کا کوئی استاد مکہ معظمہ میں ان کے پاس پہنچ جائے تو اُسے وہ اپنی باتیں سُنائیں۔ ذاکر صاحب نے اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے پروفیسر محمد سرور صاحب کو اُن کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا مرحوم مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان پہنچے اور سندھ میں اپنے عزیزوں سے ملنے کے بعد جامعہ تشریف لائے اور ۱۹۴۴ء تک جو ان کی وفات کا سال ہے، جامعہ ہی ان کا مستقر اور مرکز رہی، وہ اکثر سفر میں رہتے اور لوٹتے تو جامعہ ہی لوٹتے، جامعہ کو دیکھ کر اُن پر جو اثر ہوا تھا اُسے انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

"ہم ایک طویل زمانہ دوسری قوموں کی ترقی کے سامان دیکھتے دیکھتے پہلے حسرت اور پھر وحشت کے غلبے سے پریشان ہو گئے تھے۔ اگر چند روز اور اسی طرح رہتے تو ممکن تھا کہ ہم اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتے..... جب ہم جامعہ نگر پہنچے تو سب سے پہلے جامعہ کی شاندار عمارت سے ہم متاثر ہوئے ہم نے استانبول میں باسفورس کے کنارے کالج دیکھے ہیں، ہمیں وہی لطف جمنا کی اس وادی

میں نظر آیا۔ جب ہم اِسے اپنی چیز سمجھتے ہیں تو دماغ کی گہرائیوں تک سرور محسوس ہوتا ہے
..... ہماری طبیعت جب سے ہم وطن میں آئے سبزہ اور بچّوں کو دیکھ کر فی الجملہ
سرور حاصل کرتی رہی۔ الحمد للہ کہ جامعہ نگر میں ہمیں دونوں چیزیں ملیں'۔

یہ جھاڑیاں چمن کی یہ میرا آشیانہ

جامعہ کے اساتذہ اور منتظمین کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' وہ اس تحریک کی ہمدردی
سے معمور ہیں' ہم اِسے اللہ رب العزت کی ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں "

مولانا عبید اللہ سندھی کی وفات کے بعد جامعہ والوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مرحوم نے جن بلند مقاصد کے لیے بیت الحکمت کی بنا رکھی تھی' ان کے حصول کے لیے پوری جدوجہد کریں گے اور بیت الحکمت کے کام کو آگے بڑھائیں گے۔ ۱۹۴۶ء میں جشنِ سیمیں کے موقع پر ذاکر صاحب نے اس عزم کو پھر دہرایا تھا لیکن اس کے بعد جو حالات پیش آئے انھوں نے سارے منصوبوں کی تیلیاں بکھیر کر رکھ دیں'

اب ٹھیک ۲۴ سال بعد کہ اتنے ہی عرصہ مولانا سندھی جلاوطن رہے' بیت الحکمت کا خیال آوارہ پھرنے کے بعد ذاکر حسین سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز کی صورت میں متشکل ہو کر سامنے آیا ہے' ذاکر حسین میموریل کمیٹی نے اس سنٹر کے لیے بطور ابتدائی گرانٹ تین لاکھ روپے کی منظوری فرمائی ہے' یہ سنٹر مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جائے اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے ساتھ صحیح اسلامی فکر کی اشاعت کا وسیلہ بن جائے تو ہم سمجھیں گے کہ جامعہ کے اُس کام میں وسعت اور استحکام پیدا ہو گیا ہے جسے جامعہ سچّی مذہبیت اور تہذیبی قدروں کی خدمت سے تعبیر کرتی ہے اور جسے گذشتہ پچاس برس میں اُس نے مختلف طریقوں سے انجام دیا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جامعہ ویسی نہیں رہی جیسی کہ اسے ہونا چاہیے تھا' کچھ لوگوں کا الزام ہے کہ جامعہ نے اپنا وظیفۂ بنیادی فراموش کر دیا' بہت سے ایسے ہیں جو اس کی توسیع و

ترقی سے مطمئن نہیں ہیں، کئی لوگ اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ جامعہ والے روز بروز مطمئن ہوتے جا رہے ہیں، جامعہ کے بارے میں شروع ہی سے کچھ نہ کچھ کہا جاتا رہا ہے اور جامعہ والے سُنتے سب کی اور کرتے اپنے من کی رہے ہیں، ہاں، یہ ضرور ہے کہ ہمیں اپنے فرضِ منصبی، اپنے تعلیمی و تہذیبی مشن کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے، ذاکر صاحب مرحوم اور ان کے ساتھیوں کی بتائی ہوئی اسی راہ پر ہمیں چلنا ہے، یہی راہ عزیمت کی راہ ہے، پہلے عوام کے چندے سے جامعہ چلتی تھی لیکن عوام کو اپنا رہنما ہم نے نہیں بنایا، اب حکومت کی گرانٹ سے چلتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کاسہ لیسی کی زندگی اختیار کریں اور اپنی آزادی و خودداری سے اپنے آپ کو محروم کرلیں اور حکومت کا ہم سے یہ مطالبہ بھی نہیں بلکہ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ جامعہ کی تعلیمی شخصیت، تہذیبی کردار اور اس کی وہ تمام خصوصیات باقی رہیں جن کی وجہ سے یہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے بازو نہ سمیٹیں اور ہر لمحہ ایک نئی پرواز کے لیے تیار رہیں۔

جامعہ کے پچاس سال

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچاس سالہ زندگی میں بہت سے انتظامی اور تعلیمی دور آئے اور ہر دور جامعہ کے کارکنوں کے لئے نئے مقاصد، نئی ذمہ داریاں، نیا حوصلہ اور نیا ولولہ لایا۔ ہم ان اوراق میں اختصار کے ساتھ جامعہ کی زندگی کے ان مختلف ادوار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، مگر اس سے پہلے ہم اس غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کسی خاص تعلیمی تقاضے کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سیاسی ہنگامے کی پیداوار ہے۔ اس کے آغاز کو محض ایک وقتی ہیجان اور ہنگامی جوش وخروش کا رہین منت سمجھنا مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ کسی دورِ انقلاب میں جو خیالات عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ درحقیقت زمانہ انقلاب کی پیداوار نہیں بلکہ قوم کی ان بنیادی ضروریات کا مظہر ہوتے ہیں جنھیں وہ بہت پہلے سے محسوس کرتی آئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تخیل نے عمل کا جامہ ایک انقلابی دور میں پہنا مگر اس کی ضرورت ایک عرصہ سے مسلمانوں کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی، اس تخیل کی ابتدا انگریزوں کے اقتدار کی تاریخ میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

ہندوستانی مسلمان اور سرکاری تعلیم

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ابتدائی زمانے سے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں

کے نظام تعلیم کی عمارت منہدم ہونا شروع ہو گئی۔ اجنبی حکومت نے اس برباد شدہ عمارت کی بنیادوں پر ایک نئے تعلیمی نظام کی عمارت کھڑی کرنا ضروری سمجھا۔ اس نے پڑھے لکھے ملازم تیار کرنے کے لئے ہندوستانیوں میں ایک نئی قسم کی تعلیم کو رواج دینا شروع کر دیا۔ وارن ہشٹینگز کی پالیسی میں قدیم مشرقی تعلیم کو عصر جدید کے رنگ میں رنگ کر اور ضروریات زمانہ کے مطابق بنا کر قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بعد میں یہ خیال ترک کر دیا گیا اور عام طور سے مکالے کا یہ نظریہ کہ ہندوستان کی نجات خالص مغربی تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے، مقبول ہو گیا۔ مسلمان اس تعلیم سے جو ان کی مذہبی اور تہذیبی روایات سے بالکل بے تعلق تھی اس قدر بدظن تھے کہ اپنے بچوں کو جاہل رکھنا ان کو انگریزی مدرسوں میں پڑھانے سے بہتر سمجھتے تھے، وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے پرانے قسم کے عربی مدرسوں کو کافی جانتے تھے اور اس سے آگے قدم بڑھانے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ مدرسے اول تو بڑی خستہ حالت میں اور بہت تھوڑی تعداد میں باقی رہ گئے تھے، دوسرے ہندستانی مسلمانوں کے لیے ان مدرسوں کی چہار دیواری میں اس طرح قلعہ بند ہو کر رہنا کہ انھیں دوسری قوموں کے جدید علمی کارناموں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے، خودکشی کے مترادف تھا۔ اجنبی اقتدار کی نظر میں ایسی تعلیم کی وقعت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اگر مسلمان کچھ دن اور اس نئے نظامِ تعلیم سے اسی طرح بے توجہی برتتے تو وہ ہندوستان کے انتظامی اور دوسرے معاشی شعبوں سے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال دئے جاتے اور انھیں پھر شاید صدیوں تک سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملتا۔ ان معاشی اور عملی مصلحتوں سے مجبور ہو کر انھیں ایک مدت کے بعد مصالحت کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ سرسید کی قیادت میں ایک تعلیمی تحریک شروع ہوئی جس نے مغربی دنیوی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے قابل قبول بنانے کی غرض سے اس کے ساتھ کسی قدر دینی تعلیم دینا شروع کر دی۔ یہ تعلیمی نقشہ جو ہنگامی ضرورت سے کھینچا گیا تھا، حقیقت میں مسلمانوں کے ملی نصب العین کے مطابق

نہ تھا۔ خود سرسید مرحوم نے مسلمانوں کی آئیڈیل تعلیم کے جو خاکے قلمبند کئے ہیں وہ اس سے کہیں بلند تھے۔ انھوں نے محمڈن کالج کھول کر مسلمانوں کی ایک وقتی ضرورت کو پورا کر دیا تھا لیکن وہ اسے مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کا مکمل حل نہ سمجھتے تھے۔ اس کے لئے ان کے نزدیک ایک آزاد یونیورسٹی کا قیام ضروری تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم گورنمنٹ کی مداخلت سے کلیتہً آزاد اور خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں نہ ہوگی، قوم وملت کو پورا فائدہ نہ پہنچ سکے گا۔ سرسید نے سید محمود سے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو اسکیم تیار کرائی تھی، اس میں کہا گیا ہے :

"یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ برطانوی حکومت ہماری ان حاجتوں کو جو تعلیم وتربیت سے تعلق رکھتی ہیں پورا پورا سمجھے یا ان کا کامل طور سے بندوبست کر سکے۔ اگر ہم کو کچھ روپے کی مدد حکومت دے تو ہمیں اس کی نگرانی پر کچھ عذر نہ ہوگا بشرطیکہ ہمارے انتظام میں کچھ مداخلت نہ ہو۔"

اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اس نصب العین کو سرسید مرحوم نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے بیان کیا تھا :

"جب تک لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں۔ پس ملک کے لئے یہ زیادہ تر مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیٰحدہ ہو جائے۔"

آزاد تعلیم کا یہ تصور مسلمانوں کی اس ذہنیت کے عین مطابق تھا جس نے ان کو کئی سو سال کے دور اقتدار میں تشکیل پائی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم خود ان کے اقتدار کے زمانہ میں بھی حکومت کی دست اندازیوں سے آزاد تھی۔ اور ان کے تمام تعلیمی ادارے حکومت کی مداخلت سے محفوظ رہ کر ملک وملت کی خدمت میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ بغداد میں جب مدرسۂ نظامیہ

کی بنیاد اسلامی حکومت کے ہاتھوں سے رکھی گئی تو اس دن علمار نے جمع ہو کر ماتم کیا کہ افسوس آج علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لئے پڑھایا جائے گا۔
اسلامی ہند میں مسلمان بادشاہ مدارس کو مالی امداد تو دیتے لیکن ان کے انتظامی اور تعلیمی نظام میں کبھی دخل نہ دیتے تھے۔ امریکہ اور یورپ میں بھی جہاں جمہوریت کا دور دورہ ہے آزاد تعلیم کے اسی تصور کو پسند کیا جاتا ہے۔

علی گڑھ کالج اور آزادانہ تعلیمی نظام کی کوششیں

سرسید ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کو اس لئے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ حکومت کے جاری کردہ نظام تعلیم میں صرف ایسے اشخاص کا لحاظ رکھا گیا تھا جو زمانہ تعلیم کے بعد گورنمنٹ کے سررشتہ جات میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کی ملازمت زندگی کے ہمہ گیر پہلوؤں میں سے صرف ایک پہلو ہے، جو لوگ اپنی زندگی کو جماعتی تنظیم کے کسی دوسرے شعبے کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے حکومت کے اس جاری کردہ نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہ تھی۔ اجنبی حکومت کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کے لیے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرے جس میں ملازمت کے علاوہ دوسرے شعبہ جاتِ زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا سامان ہو۔ یہ خود ہندوستانیوں کا کام تھا۔ اور صرف وہی اسے انجام دے سکتے تھے۔ سرسید کا نصب العین کسی قلیل مدت میں تکمیل نہ پا سکتا تھا۔ وہ شاید اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے کو قدرت کے قانونِ ارتقار کے ماتحت اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے بہت سے مدارج سے گزرنا پڑے گا۔ ان کی زندگی ہی میں علی گڑھ کالج کو حکومت نے اپنے سیاسی اغراض کا آلۂ کار بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان کے بعد تو یہ حقیقت بہت واضح طور پر لوگوں کے سامنے آگئی، لیکن سرسید کے جانشین اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب علی گڑھ کالج اس منزل تک پہنچ جائے

جہاں اسے ایک آزاد یونیورسٹی میں تبدیل کیا جا سکے۔ یہ منزل جوں جوں قریب آتی گئی، کالج کے ہندستانی کارکنوں اور انگریزی اسٹاف کے درمیان جو کالج میں اجنبی حکومت کے ایجنٹ کے فرائض انجام دے رہے تھے، کشاکش بڑھتی گئی۔

جس زمانہ میں وقارالملک نے علی گڑھ کالج کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اس وقت تک کالج کو یونیورسٹی بنانے کے امکانات قریب تر ہو گئے تھے۔ وقارالملک کا تدبر اور انتظامی قابلیت مسلم ہے، وہ یہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ انگریزی اسٹاف نے کالج کی زندگی میں جو اقتدار حاصل کر لیا ہے اور جس کی وجہ سے آنریری سکریٹری اور ٹرسٹیز کی جماعت برائے نام رہ گئی ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی بھی حکومت کی دست اندازیوں سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ انگریزی اسٹاف کے طرز عمل کی گذشتہ تاریخ سرسید کے زمانے سے اب تک ان کے پیش نظر تھی، اور وہ خوب جانتے تھے کہ اسٹاف کو ارکانِ حکومت اور سررشتۂ تعلیم کے اعلیٰ عہدہ داروں پر پورا اعتماد ہے کہ وہ ہر موقع پر ان کی حمایت کریں گے۔ انھوں نے نہایت احتیاط اور تدبر کے ساتھ کالج کو ان لوگوں کے مضر اقتدار سے محفوظ رکھنے کی کوشش شروع کر دی۔ ۱۹۰۹ء تک وہ اپنی اس جدوجہد میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ اس کے بعد کالج کو یونیورسٹی بنانے کی کوششیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہو گئیں۔ سب سے پہلے روپے کی ضرورت تھی۔ چندہ ہوا، علی برادران اور اس زمانے کے دوسرے رہنماؤں کی مدد سے بہت جلد مجوزہ رقم جمع ہو گئی اور یہ طے پایا کہ ملک معظم کی تاجپوشی کے موقع پر مجوزہ یونیورسٹی کا آغاز کر دیا جائے۔ کانسٹی ٹیوشن بنانے اور حکومت سے اسکیم منظور کرانے کا کام مختلف کمیٹیوں کے ذمہ کر دیا گیا۔ حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ یونیورسٹی کو اسلامی کالجوں اور اسکولوں کے الحاق کا اختیار دیدے۔ گورنر جنرل چانسلر کی حیثیت سے یونیورسٹی کی عام نگرانی کرے لیکن باقی سب اختیارات قوم کے نمائندوں کے ہاتھ میں

رہیں۔ اس اسکیم میں حکومت کی نگرانی کو ایک حد تک تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن بڑی حد تک اسے آزاد اور خود مختار رکھنے کی تجویز کی گئی تھی۔ حکومت نے مسلمانوں کے اس قومی مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ نہ مجوزہ یونیورسٹی کو الحاق کا اختیار دینا منظور کیا اور نہ گورنر جنرل کو چانسلر بنانے کی تجویز منظور کی، بلکہ اس کے برعکس یہ طے کیا کہ یونیورسٹی کے تمام معاملات گورنر جنرل باجلاس کونسل کے ذریعہ انجام پائیں، اپنے تعلیمی نظام میں مسلمان، حکومت کی اس حد تک دست اندازی کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ حکومت کے اس فیصلہ کی وجہ سے ہندستان کے تمام مسلمانوں میں ناراضگی اور بددلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اسی زمانہ میں اپنی ایک مشہور نظم میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

ہمیں یکحرف از یونیورسٹی مدعا باشد — کہ ایں سر رشتۂ تعلیم با در دست ما باشد

علوم تازہ را با شرع و حکمت باہم آمیزیم — الہٰی باریاضی و طبیعی آشنا باشد

نواب وقار الملک اگرچہ کالج کی سکریٹری شپ سے علیحدہ ہو گئے تھے، لیکن ان کی رائے اب بھی کالج کے کارپردازوں کے حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ انھوں نے یونیورسٹی کے متعلق ایک مفصل اسکیم تیار کی جس میں حکومت کی تجاویز پر سخت تنقید کی گئی تھی اور انھیں مسلمانوں کے لئے مضر قرار دیا گیا تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ اگر کافی غور و بحث اور کوشش کے بعد بھی گورنمنٹ سے معاملہ طے نہ ہو اور حکومت کی نگرانی میں آزاد یونیورسٹی کا قیام ناممکن نظر آئے تو یونیورسٹی کے لئے جو روپیہ جمع ہوا ہے اس کو ایک ایسے جامعہ اسلامیہ کے قیام پر خرچ کرنا چاہئے جو گورنمنٹ کے چارٹر کا منت کش نہ ہو۔ اس اسکیم میں وہ کہتے ہیں:

"میں چند ماہ پہلے تک جب تک کہ چارٹر کا مل جانا بہت کچھ ممکن تھا۔ اس سوال کو حتی الامکان بایں خیال ٹالتا رہا کہ اس قسم کے مباحثات شروع ہونے کے بعد نفس مطلب سے لوگوں کی توجہ ہٹ جائے گی اور روپیہ کے جمع ہونے میں خلل واقع ہوگا، لیکن گورنمنٹ کے پریس کمیونک اور رسر ہارکورٹ بٹلر بالقابہ کے مراسلہ

مورخہ ۹ر اگست کے مشتہر ہونے کے بعد اب بحث کا ٹالنا ناممکن ہے، جن لوگوں نے بانی کالج کی اسکیم کو پڑھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سرسید مرحوم ومغفور کا منشار کالج قائم کرنے سے صرف یہ نہیں تھا کہ چند امیدواران ملازمت اُس کے ذریعے سے ڈگریاں حاصل کریں اور گورنمنٹ کی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ بلکہ ان کا مقصد اس سے بہت اعلیٰ وارفع تھا.....

چونکہ گورنمنٹ کی طرف سے ہم کو یونیورسٹی کے ملنے میں دقت پیش آئی ہے، لہٰذا میری یہ رائے ہے کہ اب ہم کو اپنی تعلیم کا پروگرام بدل دینا چاہئے۔ یعنی اب تک جو یہ خیال تھا کہ علی گڑھ کالج ترقی کرکے آل انڈیا مسلم یونیورسٹی بن جائے گا اور اس یونیورسٹی کے ذریعہ سے ہم اپنی ہر قسم کی قومی تعلیمات کا انتظام کرسکیں گے، اس کی جگہ اب ہم کو یہ کرنا چاہئے کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے اپنی ایک علیحدہ "جامعہ اسلامیہ" (قومی دارالعلوم) خود قائم کریں اور جو سرمایہ مسلم یونیورسٹی کے واسطے جمع ہوا ہے اور ہورہا ہے وہ اس "جامعہ اسلامیہ" کے سپرد کردیا جائے جو باستثنائے ضروری اخراجات متعلق تعمیرات کے باقی فنڈ کا صرف منافع خرچ کرنے کی مجاز ہو اور اصل فنڈ کو محفوظ رکھے۔"

اس اسکیم میں جامعہ اسلامیہ کی ضرورت، خصوصیات اور طرز تعلیم پر تفصیل اور وضاحت سے گفتگو کی گئی ہے، اسکیم میں کہا گیا ہے کہ جامعہ اسلامیہ میں تمام علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہو اور انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت دی جائے۔ نواب وقار الملک اس اسکیم میں فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے وہ بچے جو آئندہ ملازمت کا طوق اپنی گردن میں ڈالنے والے نہیں ہیں وہ کیوں ریاضیات انگریزی میں پڑھیں؟ کیوں جغرافیہ انگریزی میں حفظ کریں؟ کیوں تاریخ انگریزی میں پڑھنے کی زحمت برداشت کریں؟

سائنس کے غریب آلات ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ان کا استعمال صرف یورپ کی زبانوں کے ذریعہ سکھایا جاسکتا ہے۔ وہ بسروچشم اس کے لئے حاضر ہیں کہ مسلمان ان کا استعمال اپنی مادری زبان کے ذریعہ سے سیکھیں۔"

نواب وقار الملک کی اس اسکیم کے شائع ہونے کے بعد یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی کا دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں ایک عام جلسہ ہوا اور اس میں حکومت کی عائد کردہ عام شرائط کی روشنی میں چارٹر کو قبول کرنے کے مسئلے پر غور وفکر کیا گیا۔ جلسے میں یہ طے ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک ڈیپوٹیشن بھیجا جائے، لیکن آپس میں اس قدر شدید اختلافات رونما ہو گئے تھے کہ اس فیصلہ پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ ڈیپوٹیشن کے اختیارات کے بارے میں لوگ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے اور یہ معاملہ برابر ملتوی ہوتا رہا، فاؤنڈیشن کمیٹی میں یہ معاملہ جولائی ۱۹۱۳ء میں دوبارہ پیش ہوا۔ اس موقع پر نواب وقار الملک نے کمیٹی کے ممبران کو ایک پیام میں یہ مشورہ دیا کہ:

"اختیارات کا مسئلہ بھی جانِ سخن ہے اور جو کچھ فاؤنڈیشن کمیٹی اس کے متعلق تجویز کرے، اس کی ترمیم کا اختیار بھی ڈیپوٹیشن کو فاؤنڈیشن کمیٹی کی منظوری کے بغیر نہ ہونا چاہیئے، اور امید ہے کہ فاؤنڈیشن کمیٹی اس بات کو ملحوظ رکھے گی کہ گورنمنٹ کی یونیورسٹی کے اندرونی انتظام میں بہت زیادہ اختیارات کا حاصل ہونا جناب سرسید صاحب مرحوم ومغفور اور آنریبل سید محمود صاحب مرحوم ومغفور کے اصول کے بالکل منافی ہے اور فی نفسہ بھی یونیورسٹی کے انتظام میں مخل ہوگا۔

اور اسی اختیارات کی بحث میں قطعی طور پر اس بات کو صاف کر دینا چاہیئے کہ چانسلر کے اختیارات گورنر جنرل باجلاس کونسل کو کسی حالت میں تفویض نہ کئے جائیں۔"

فاؤنڈیشن کمیٹی نے نواب صاحب کے مشوروں کو قبول کر لیا اور ان کی تعمیل کرنا ایسوسی ایشن

کافرض قرار دیا گیا۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی لڑائی چھڑ جانے کے بعد جب علی برادران اور ملک کے دوسرے سربرآوردہ رہنماؤں کو نظر بند کر دیا گیا تو فاؤنڈیشن کمیٹی کے ان ممبران نے جو حکومت کی تجویز منظور کرنے کے حق میں تھے اس بات کی کوشش شروع کر دی کہ مسلمان حکومت کی شرائط کو قبول کرلیں اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہندوؤں نے ان شرائط کو قبول کر لیا ہے اور وہ حکومت کے چارٹر کے ماتحت بنارس یونیورسٹی بنا رہے ہیں، اگر مسلمانوں نے ان شرائط کے قبول کرنے میں دیر کی تو وہ تعلیمی میدان میں ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں گے۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر ضیاء الدین مخالف فریق کے لیڈروں کی نظر بندی سے فائدہ اٹھا کر اس اسکیم کو منظور کرانے کے درپے ہو گئے، پھر بھی حکومت سے گفت و شنید میں کئی سال لگ گئے۔ آخر ان حضرات نے ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کی طرف سے حکومت کی شرائط کو تسلیم کر لیا اور انھیں یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا۔

۱۹۱۵ء میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کے جلسے کے بعد علی گڑھ کے بہت سے بہی خواہوں کو یقین ہو گیا کہ حکومت علی گڑھ کالج کو ایک آزاد یونیورسٹی نہیں بننے دے گی چنانچہ وہ علی گڑھ کالج سے علیحدہ ہو گئے اور انھوں نے نواب وقار الملک کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور ان کے ساتھیوں نے بیگم بھوپال کی سرپرستی میں 'سلطانیہ کالج' کے نام سے ایک ادارہ کھولنے کی تیاری شروع کر دی اور طے پایا کہ یہ کالج دہرہ دون جیسے پرفضا مقام پر قائم کیا جائے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جامعہ کے ابتدائی دور کے ایک طالب علم کے الفاظ میں، "علی گڑھ کے حلقوں میں اس بات پر غصہ تھا کہ برطانوی حکومت نے مسلم یونیورسٹی کے متفقہ مطالبہ کو ٹھکرا کر ملت کی توہین کی ہے اور اس کے طلبہ اس بات پر بحث کرتے تھے کہ اب کچھ کرنا چاہیئے، اور اگر کچھ نہ ہو سکے تو پھر ہجرت کرنا چاہیئے۔ کالج کے بعض حلقوں میں یہ خبر مشہور تھی کہ والیٔ بھوپال کی سرپرستی میں عنقریب سلطانیہ کالج کے نام سے ایک آزاد دارالعلوم دہرہ دون میں بننے والا ہے اور علی گڑھ کالج کے اکثر طلبہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس اب ہم

ہوں گے اور سلطانیہ کالج کی تعلیم اور سامراج دشمنی کی فضا۔" سلطانیہ کالج کے قیام کے لئے جو کوششیں کی گئیں، وہ ان لوگوں کی طرف سے تھیں جن کا سیاست کی ہنگامہ خیز زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کی کوششیں اگرچہ کامیاب نہ ہوسکیں لیکن ان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ مسلمانوں میں آزاد تعلیمی ادارہ کا تصور روز بروز مقبول ہو رہا تھا۔

تحریکِ خلافت اور علی گڑھ کالج

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر جب ہندوستان کے رہنما جیل کی چار دیواری سے باہر نکلے تو دنیا کے تمام مسلمان ایک دورِ انتشار سے گذر رہے تھے۔ اتحادی ممالک سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے درپے تھے۔ ترکی "خلافت" کے ذریعہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا فرض اگرچہ برائے نام سہی صدیوں سے انجام دے رہا تھا۔ دنیا کے تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس کے لئے عقیدت و احترام کے جذبات موجزن تھے۔ جو حکومتیں ترکی اور دوسرے ممالک اسلامیہ کی آزادی چھیننے کی فکر میں سرگرمِ عمل تھیں، مسلمانوں کی نظر میں وہ اسلام کی کھلی ہوئی دشمن تھیں۔ انگریز اس شرمناک جدوجہد میں سب سے پیش پیش تھے۔ اس لئے مسلمانوں میں ان کے خلاف غصہ اور نفرت کی لہر دوڑنا ناگزیر تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی حکومت برطانیہ کے اس رویہ کی وجہ سے ہل چل مچ گئی۔ انھوں نے ملک کے چپہ چپہ میں حکومت کے خلاف جلسے کئے اور بالآخر اسلامی ممالک اور منصبِ خلافت کی حفاظت کے لئے ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کے نام سے ایک مستقل جماعت قائم ہوگئی۔ اس جماعت نے برطانوی حکومت کا مقابلہ کرنے اور اسلامی ممالک اور خلافت کی حفاظت کرنے کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو منظم کرنا شروع کردیا۔ کام کچھ اس جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا کہ بڑی قلیل مدت میں ہندوستان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک سیاسی بیداری کی ایک زبردست لہر اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ یہ لہر حکومت برطانیہ کے اقتدار کی سو سالہ تعمیر کو بہت جلد

بہا کر لے جائے گی۔

مسلمانوں کے وہ رہنما جو برسوں سے علی گڑھ کالج کو ایک آزاد یونیورسٹی کی شکل میں دیکھنے کے لئے بے تاب تھے اور جن کے علی الرغم علی گڑھ کالج کے چند کارپرداز ایک غلام یونیورسٹی کا پروانہ حاصل کرنے کی فکر میں تھے، اسے کسی طرح گوارا نہ کر سکتے تھے کہ مسلمان بچوں کی تعلیم ایک ایسی حکومت کے سپرد کر دی جائے جو اسلام کی کھلی دشمن ثابت ہو رہی ہے۔ انھوں نے علی برادران کی قیادت میں علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور مجوزہ یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی سے یہ مطالبہ کیا کہ "حکومت برطانیہ اسلام کی کھلی دشمن ہے، نہ اس کا دیا ہوا چارٹر قبول کیا جائے نہ اس کا روپیہ، نہ اس کے بدلے اسے وہ اختیارات دیے جائیں جو ہمیں اس کا غلام بنا دیتے ہیں۔" اس کا جواب ان لوگوں کی طرف سے جو مسلمان عوام کے خیالات اور جذبات سے بے پروا ہو کر یونیورسٹی کا چارٹر قبول کرنے کی تیاری کر رہے تھے اور اس پر بہت خوش تھے یہ ملا کہ "بھلا تم اتنا سرمایہ کہاں سے جمع کر کے لا سکتے ہو، جس کی سالانہ آمدنی حکومت کی سالانہ گرانٹ کے برابر ہو سکے، پہلے روپیہ جمع کر کے لاؤ، پھر ہم بھی گورنمنٹ کو جواب دیدیں گے۔" مجوزہ یونیورسٹی کے کارپردازوں نے دینے کو تو یہ جواب دیدیا لیکن انھیں یہ خبر نہ تھی کہ مسلمان عوام میں اجنبی حکومت کے خلاف سیاسی بیداری کی جو لہر دوڑ گئی ہے وہ علی گڑھ کالج کے کارکنوں اور طلبا میں بھی پھیل سکتی ہے۔ مسلمان قوم کے مطالبات اور ان کے جذبات و خیالات سے وہ تو کنارہ کش ہو سکتے ہیں لیکن نوجوان طلبہ جو وقت کے اہم تقاضوں کو محسوس کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اپنی قوم اور اس کے جائز مطالبات سے ہرگز ناتا نہیں توڑ سکتے۔ وہ باہمت جماعت جس کو ساتھ لے کر مسلمان رہنما آزاد جامعہ کے تصور کو عملی شکل دے سکے، علی گڑھ کالج کے ہونہار طالب علموں ہی پر مشتمل تھی۔

جنوری ۱۹۲۰ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ

بن چکے تھے۔ خلافت کمیٹی نے مسلمانوں کے سامنے ترک موالات کا شرعی پروگرام پیش کر دیا تھا اور کانگریس نان کوآپریشن کا فیصلہ کر کے ہندوستانیوں سے قربانی ایثار اور عمل کے بے پناہ مظاہروں کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ایک طرف علی برادران اور دوسری طرف گاندھی جی ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ ملک کے کونہ کونہ میں جوش کی لہر دوڑ گئی اور ہندوستانی مسلمان ہوں یا ہندو بلا امتیاز مذہب وملت سرکاری اداروں سے تعلقات قطع کرنے لگے اور انھوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ علی گڑھ کالج کے لڑکوں میں خلافت تحریک سے بہت دلچسپی تھی اور وہ نظری طور پر علی برادران کے ہمنوا تھے۔ مگر رجعت پسندوں نے انھیں عملی قدم اٹھانے کے قابل نہ رکھا تھا۔ وہ کشش و پنچ میں تھے کہ جن سیاسی اور تعلیمی نظریوں کو وہ صحیح سمجھتے ہیں انھیں عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے کونسا قدم اٹھائیں۔ بعض جوشیلے طالب علم مولانا محمد علی کے پاس پہنچے اور انھیں دعوت دی کہ وہ علی گڑھ آکر طلبہ کو ترک موالات کا پیام دیں اور ان سے مطالبہ کریں کہ وہ علی گڑھ کالج اور مجوزہ یونیورسٹی سے قطع تعلق کر کے وقت کے فیصلہ کے آگے سر جھکائیں۔ مولانا محمد علی تو خود یہی چاہتے تھے کہ پھر کوئی ایسی سبیل نکلے کہ وہ علی گڑھ کالج کو رجعت پسندوں کے قبضہ سے نکال سکیں اور اسے ایسی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہونے سے بچائیں جسے اغیار کی عائد کردہ پابندیوں میں رہ کر کبھی پنپنے کا موقع نہ ملے۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا کہ "سرکاری تعلیمی اداروں سے تعلقات قطع کرنے کا کام ہم کو علی گڑھ سے شروع کرنے دیں" اور وہ گاندھی جی کو ساتھ لے کر علی گڑھ جا پہنچے۔ طلبائے کالج کا جلسہ ہوا، تقریروں میں علی برادران اور گاندھی جی نے طلبہ کو ترک موالات کا پیام دیا، کالج کے کارپردازوں نے پہلے ہی سے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ جلسہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پائے، کچھ لوگ الٹے سیدھے سوالات کرنے پر اور کچھ مقررین پر فقرے کسنے پر متعین کئے گئے تھے انھوں نے اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور طلبہ اپنے رہنماؤں کی دعوت پر

لبیک نہ کہہ سکے۔ یہ کام بڑا مشکل تھا جس کا فیصلہ وہ اس وقت کر سکتے تھے جب اپنے آپ کو ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لئے آمادہ پائیں اور ہر طرح کی تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

جن طلبہ کے جوش وخروش نے علی برادران کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی تھی ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ملک کے اس مطالبہ سے علی گڑھ کی اس بے اعتنائی اور بے تعلقی کو دیکھ کر جن طلبہ کو افسوس ہوا اور ان کے سر غیرت سے جھک گئے وہ تھے جنھوں نے پہلے نہ جوش کے نعرے لگائے تھے اور نہ مولانا محمد علی کو علی گڑھ میں ترکِ موالات کی دعوت دینے کے لئے آمادہ کیا تھا، یہ سب ہونہار طالب علم تھے، قوم کے مطالبوں سے انہیں دلی لگاؤ تھا لیکن چاہتے تھے کہ اپنی تعلیم ختم کرلیں اور پھر یکسو ہو کر قومی تحریک میں شریک ہو جائیں، لیکن اب جبکہ طبلِ جنگ بج چکا تھا، سالارِ قافلہ کی طرف سے کوچ کا اعلان ہو گیا تھا وہ یہ کیسے دیکھتے کہ قوم وملت کا قافلہ قربانی اور ایثار کی کٹھن راہوں اور تکلیف ومصیبت کی دشوار گذار وادیوں کی طرف روانہ ہو اور مسلمانوں کے اس عظیم الشان علمی مرکز سے معدودے چند آدمی بھی راہِ سفر کی دشواریوں کو جھیلنے کے لئے آمادہ نہ ہوں، ان کی تحریک پر یونین میں طلباء کا ایک جلسہ پھر ہوا، اس کا رنگ پہلے جلسہ سے کچھ مختلف ہی تھا، طلباء میں جوش وخروش پھیلا ہوا تھا اور یہ نظر آتا تھا کہ وہ پہلے دن کے واقعہ پر نادم ہیں اور اس کی مکافات میں ہر بڑی سے بڑی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہیں، جوشیلی تقریریں ہو رہی تھیں اور فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے کہ اتنے میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ہال میں داخل ہوئے۔" جو لوگ اس وقت جلسہ میں موجود تھے وہ ساری عمر اس کو نہ بھول سکے۔ دونوں بھائیوں نے بس دو دو چار چار منٹ تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ "علی گڑھ ہمارا روحانی گھر تھا، ہم یہاں بڑے ارمان لے کر آئے تھے بہت دل شکستہ جاتے ہیں۔ خدا حافظ" ہزاروں نوجوانوں کا مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا، بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ایک کہرام تھا، دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑتے تھے۔ اس عالم

میں علی برادران ہال سے چلے گئے، مگر یہ چند منٹ بہتوں کے لئے زندگی کے فیصلہ کن منٹ بن گئے۔" مولانا محمد علی کے جانے کے بعد بڑی جوشیلی تقریریں ہوئیں اور مجمع کا یہ رنگ تھا کہ ایک طالب علم نے جب یہ کہا کہ "ہمیں بے شک اس ادارہ کو چھوڑنا چاہیئے، جو لوگ ہمیں یہاں سے جانے کی دعوت دے رہے ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ اس سے بہتر تعلیم کے انتظام کی ذمہ داری لیں" تو چاروں طرف سے لوگ اس معقولیت پسند مقرر پر برس پڑے اور کہنے لگے یہ بے ایمان ہے، یہ ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے، یہ چاہتا ہے کہ ہمارے جوش کو ٹھنڈا کر دے، یہ جاسوس ہے۔ اسے ڈاکٹر ضیاء الدین نے ملازم رکھا ہے۔" ابن حسن صاحب اور ذاکر حسین صاحب نے لوگوں کو اس تجویز کی معقولیت لاکھ سمجھائی مگر جوش میں کسے یہ خیال رہتا ہے کہ کونسی بات معقول ہے اور کونسی نامعقول، یہ دونوں حضرات بھی طعن وتشنیع کا ہدف بن گئے، کیونکہ وہ دونوں ایم اے کے آخری سال میں تھے، اور حال ہی میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوئے تھے، اعتراضات کا مرکز ان کی یہی حیثیت تھی۔ ذاکر صاحب آخری مرتبہ پھر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اس دفعہ ان کی تقریر نے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا، اس لئے نہیں کہ اس مرتبہ انھوں نے پہلے سے بہتر دلیلیں دی تھیں بلکہ اس لئے کہ انھوں نے کہا کہ "میں اپنی لکچراری سے مستعفی ہوتا ہوں۔" ذاکر صاحب کے اس بروقت اقدام نے لوگوں کو ان کے خلوص کا یقین دلا دیا، اب کیا تھا۔ لوگ کھڑے ہو ہو کر خلوص وصداقت کا امتحان دینے لگے۔ وظیفہ لینے والوں نے وظیفہ نہ لینے کا اعلان کیا اور جن کا تعلق علی گڑھ کالج سے کسی حد تک ملازمت کا تھا انھوں نے استعفے کا۔ اب یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی کہ کالج سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ سرکاری تعلق کو چھوڑ دے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو قوم نوجوانوں کی تعلیم کا دوسرا انتظام کرے، ایک نئی تعلیم گاہ کے خیال نے اس طرح پھر قوت پائی۔ علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی اور مسلمانوں کے دوسرے اہل فکر اور سیاسی کام کرنے والوں نے طلبہ کے اس مطالبہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور سب نے مان لیا

کہ اگر علی گڑھ مسلمانوں کے مطالبہ کو ٹھکراتا ہے تو مسلمانوں کو اپنے نوجوانوں کا مطالبہ ماننا ہوگا۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام

۲۹ ؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن جوشیلے طلبہ اور اساتذہ علی گڑھ کالج کی مسجد میں جمع ہوئے۔ مولانا محمد علی نے دلوں کو گرمانے والی تقریر کی۔ آخر میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا خطبہ تاسیس پڑھ کر سنایا گیا۔ اس طرح ان رہنماؤں کے مقدس ہاتھوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رسم افتتاح ادا ہوئی اور برسوں کے انتظار کے بعد مولانا محمد علی اور حضرت شیخ الہند کے ذریعہ اس نئے تعلیمی ادارے کی شکل میں دیوبند اور علی گڑھ کا سنگم ہوگیا جو اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان ایک طرف تو اپنی صدیوں کی ذہنی اور روحانی کمائی کو آئندہ نسل کی طرف منتقل کر کے اپنے تئیں تباہی سے بچائیں گے اور دوسری طرف اس نئی نسل میں یہ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ بزرگوں سے پائے ہوئے تمدّنی خزانہ میں خود اپنی جدوجہد سے اضافہ کر سکے۔

حضرت شیخ الہند اپنے افتتاحی خطبۂ صدارت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

> "اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔
>
> کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور

مجھ کو میرے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔"

علی گڑھ کالج کے منتظمین نے جب یہ دیکھا کہ ان کا اقتدار خطرہ میں ہے، جوشیلے طلبا اور اساتذہ سے اپنی بات منوانا تو درکنار وہ ان کے سامنے اس کا اظہار بھی نہیں کرسکتے تو انھوں نے پوشیدہ طور پر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ حکومت کے حکام سے مشورہ کیے گئے، ان کے ہوا خواہ ملک کے گوشہ گوشہ سے اپنے سرکاری اور غیر سرکاری فرائض سے چھٹیاں لے کر علی گڑھ کو بچانے کے لئے، نکل کھڑے ہوئے۔ طلبہ سے اپنی بات نہ منوا سکے تو ان کے والدین کو لکھا کہ "تمھارے لڑکے کی جان خطرہ میں ہے آ سے آکر لے جاؤ۔" حکومت سے کہا کہ "لڑکے باغی ہو گئے ہیں پولیس اور فوج بھیجئے تاکہ ان پر قابو حاصل کیا جائے۔" طلبہ سے علیحدہ علیحدہ چھپ چھپ کر ملے اور انھیں ولایت کے وظیفوں کا لالچ دے کر اور نوکری کے سبز باغ دکھا کر ورغلانے کی کوشش کی۔ غرض ہر طرح علی گڑھ کے طلبہ کو منتشر کرنے کی تدبیر کرتے رہے، لیکن پھر بھی کوئی تین سو لڑکے رہ گئے، ڈائننگ ہال سے کھانا بند کر دیا گیا تو طلبہ نے کھانے کا اپنا انتظام کر لیا۔ ملک کے بڑے بڑے رہنما اولڈ بوائز کی عمارت میں مقیم رہے، وہ اور طلبہ سب وہاں جمع ہوتے اور آئندہ کے لئے پروگرام بناتے، مختلف تجویزیں تھیں، کوئی کہتا اس کالج کو چھوڑ کر دوسرا ادارہ بنایا جائے، بعض کی رائے تھی کہ قوم ہمارے ساتھ ہے، طلبہ ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ علی گڑھ کالج ہی کو رجعت پسند عناصر سے آزاد کرانا چاہیئے اور اس کے ذریعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اسکیم کو پورا کیا جائے اور کالج کی چار دیواری سے اس وقت تک نہ نکلنا چاہیئے جب تک جبرانہ نکالا جائے۔ کالج کے کارپردازوں کی جب یہ تمام کوششیں اکارت گئیں تو انھوں نے پولیس کی مداخلت کے ذریعہ اپنے اقتدار کو سنبھالنے کی آخری مرتبہ ایک اور کوشش کی۔" ایک دن صبح سویرے کالج کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال لیا، پولیس کا ایک افسر

مولانا محمد علی کے نام حکم لے کر پہنچا کہ طلبہ کے ساتھ نکل جائیے، وہ قافلہ جب اس تعلیم گاہ سے نکلا ہے، جسے وہ اپنے گھر سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تو دیکھنے والوں کے دل ہل گئے۔ اِدھر اُدھر فوج کے سپاہی سنگینیں لئے ہوئے، بیچ میں طالب علموں کی قطار، سامنے ایک نوجوان ایک ہرا جھنڈا لئے تھا جس پر کلمۂ طیبہ لکھا تھا، ساتھ ساتھ مولانا محمد علی اور دوسرے اکابر تھے، نواب محمد اسمٰعیل خاں نے کہیں سے خیموں کا انتظام کیا تھا، قافلہ جا کر ان خیموں میں آترا۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی، کھانے پکانے کی کسے سدھ تھی اور کسے موقع۔ ابھی اپنی چھاؤنی میں پہنچے بھی نہ تھے کہ شہر کے لوگ دیگوں میں پکا ہوا کھانا ٹھیلوں پر لادے پولیس کے گھیرے سے بچتے بچاتے پہنچ گئے۔ شام کو بھی کھانا شہر سے آیا۔ رہنے سہنے کی خاصی تکلیف تھی، فوج کے سے انتظامات تھے۔ پر فوج کا ساز و سامان نہ تھا، مگر جن لوگوں نے وہ تکلیف جھیلی تھی وہ سب کہتے ہیں کہ ایسا لطف کا زمانہ عمر بھر نصیب نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ تعلیمی نظم قائم ہوگیا۔ مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ تھے۔ اونچے درجے کے طلباء میں سے بعض درس کے لئے مقرر ہوئے۔ ذاکر حسین صاحب، نور اللہ صاحب، سید محمد صاحب، رؤف پاشا صاحب وغیرہ۔ علی گڑھ کے استادوں میں سے مولانا اسلم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب اور عبدالکریم صاحب فاروقی ترک موالات کر کے ان لڑکوں ہی کے ساتھ چلے آئے۔" اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی پہلی آزاد تعلیمی درس گاہ نے آزاد فضا میں اپنا کام شروع کر دیا۔

جامعہ نے ایک قومی سیاسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے اس کی پرورش اور نگہبانی کا فرض ابتدا میں سیاسی رہنماؤں ہی کو انجام دینا پڑا۔ نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی فاؤنڈیشن کمیٹی، خلافت تحریک کے سرگرم کارکنوں ہی پر مشتمل تھی اور اس کمیٹی نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو جو جماعت انتظامیہ تشکیل دی اس میں بھی یہی لوگ تھے۔ جامعہ کے اخراجات کا تمام بار اس زمانہ میں مرکزی خلافت کمیٹی ہی پر تھا۔ جامعہ کے قیام سے ایک سال تک کا زمانہ سیاسی ہنگاموں اور مذہبی جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایک قومی تعلیمی درس گاہ

کے لئے سیاسی تنظیم سے علیحدہ رہنا ممکن بھی نہ تھا، لیکن جامعہ کے کارکنوں کے سامنے پہلے ہی سے یہ حقیقت تھی کہ تعلیم کو سیاست سے آزاد رکھنا چاہئے۔ وہ خلافت کمیٹی کی امداد کے باوجود جامعہ کو خلافت کمیٹی کا تابع بنانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ مرکزی خلافت کمیٹی نے نومبر ۱۹۲۰ء کو اپنے ایک جلسہ میں یہ تجویز پاس کردی تھی کہ جامعہ ایک آزاد ادارہ ہے اور کسی دوسری جماعت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کے تعلیمی کام کرنے والے یہ سمجھتے تھے کہ جب تک جامعہ ملیہ کے پاس مرکزی خلافت کمیٹی کی امداد کے علاوہ ایک آزاد فنڈ نہ ہوگا، اسے صحیح معنوں میں ایک خالص تعلیمی ادارہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ۱۹۲۲ء کے آخر میں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ملک و قوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور لوگوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک خالص تعلیمی ادارہ کی حیثیت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کر دی اور یہ ان کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ مرکزی خلافت کمیٹی کے بے جان ہونے کے بعد بھی اپنے تعلیمی کام کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھ سکی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اگرچہ ۱۹۲۳ء کے شروع ہی میں خلافت کمیٹی کے اثرات سے آزادی حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور اس کے میزانئے منظوری کے لئے خلافت کمیٹی میں جانا بند ہو گئے تھے، لیکن در اصل جامعہ کا وہ انتظامی دور جسے خلافت کمیٹی کے دور سے یاد کیا جاسکتا ہے، اس وقت ختم ہوتا ہے جب جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا گیا۔

جامعہ ملیہ دہلی میں

۱۹۲۴ء جامعہ کے استادوں کے لیے آزمائش کا سال تھا۔ خلافت تحریک بے جان پڑ گئی تھی اس کی طرف سے جامعہ کو جو امداد مل رہی تھی وہ بند ہو گئی۔ سیاسی جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا وہ سیاسی رہنما جنھوں نے ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہیجان اور ملی جوش سے متاثر ہو کر تعلیمی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے اور ایک نئے نظام تعلیم کا باغ لگانے کی تیاری کی تھی، یکے بعد دیگرے انقلاب

کے نتائج کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے مشکل کام سے کنارہ کش ہو رہے تھے۔ ایسے لوگ بہت ہی کم تھے جو قومی تعلیم گاہوں کے قیام کو زمانہ انقلاب کا سب سے اہم واقعہ سمجھتے تھے۔ انقلابی جدوجہد کی ناکامی نے مسلمان رہناؤں کے حوصلے پست کر دیئے تھے اور وہ ایک آزاد تعلیمی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چلانے کی ذمہ داری لیتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جو اس تعلیمی انقلاب میں پیرکاروں کی حیثیت رکھتے تھے، انھوں نے جامعہ ملیہ کی تعمیر کا کبھی اس طرح ارادہ ہی نہ کیا تھا کہ وہ علی گڑھ کالج سے علیحدہ رہ کر پھلے پھولے۔ وہ جامعہ کی آبادی کو ایسے مہاجرین اور انصار کی جماعت سمجھتے تھے جو فتح مکہ کی منتظر رہے، ان کا اصلی قلعہ تو علی گڑھ کالج تھا اور ان کے دلوں میں اس پر قبضہ کرنے اور جامعہ کا پرچم لہرانے کی حسرت تھی، ناکامی اور مایوسی نے انھیں اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ وہ اتنا نہ سمجھ سکتے تھے کہ دوسرے قلعہ کو فتح کرنے سے پہلے اپنے قلعہ کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ غرض بعض لوگ یہ طے کئے بیٹھے تھے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کر دیا جائے۔ ایک ایسے آزاد قومی ادارہ کو چلانے کی ذمہ داری لینے سے جسے حکومت کی طرف سے مدد لینا عار معلوم ہوتا ہو، ان لوگوں کو یہی آسان نظر آیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔

ایسی نازک حالت میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نامساعد حالات سے مایوس نہ تھے اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی کھیتی کو اس طرح ضائع ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ جامعہ کے طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کی وہ جماعت تھی جس نے جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری لی تھی اور اس راہ میں ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار تھی، ان کا ایک ساتھی (ذاکر حسین) اس وقت اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گیا ہوا تھا اور خیال یہ تھا کہ وہ واپسی پر جامعہ کو چلانے میں ان کا ہاتھ بٹا سکے گا۔ ان لوگوں نے انھیں تار دیا کہ مجلس امناء کے اراکین جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں کیا مشورہ ہے؟ ذاکر صاحب نے جواب میں لکھا کہ "میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار ہیں، ہمارے آنے تک جامعہ ملیہ کو بند نہ ہونے دیا

جائے۔" جامعہ کے فارغ التحصیل طلبہ کا ایک وفد دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب سے ملا۔ ان ہی دنوں جامعہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے دلی میں مجلس امناء کا جلسہ ہونے والا تھا۔ وفد کے اراکین نے حکیم صاحب سے درخواست کی کہ وہ ذاکر صاحب کے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ انھوں نے حکیم صاحب کو یہ یقین دلایا کہ وہ جامعہ کے لئے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا "میں جامعہ ملیہ کو دہلی لے آؤں تو تم لوگ اس کے لئے کس قدر قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو۔" وفد کے اراکین نے باتفاق کہا کہ "ہم جامعہ کو قائم رکھنے کی خاطر بلا کسی معاوضہ کے کام کرنے کے لئے تیار ہیں"۔ حکیم صاحب نے انھیں اطمینان دلا کر رخصت واپس بھیجدیا۔ مجلس امناء کے اجلاس میں جامعہ کو جاری رکھنے اور بند کرنے کے مسئلے پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ حکیم صاحب نے مجلس امناء سے یہ تجویز پاس کرالی کہ جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے اور اسے چلانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے اوپر لے لی۔ یہ وقت جامعہ کے لئے بہت نازک تھا۔ عام قومی فضا سے مایوسی تھی۔ ڈر تھا کہ علی گڑھ سے دہلی لے جانے میں جامعہ ختم نہ ہو جائے۔ خیر خواہ بھی جامعہ کو بند کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ مالی امداد کی صورت کہیں سے نظر نہ آتی تھی۔

حکیم اجمل خاں نے جب ان چیزوں کا ذکر اپنے رفیق مہاتما گاندھی سے کیا اور کچھ مایوسی ظاہر کی تو گاندھی جی نے فرمایا کہ جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا، آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جامعہ کے کام کو ہرگز بند نہ ہونے دیا جائے۔ جامعہ کو دہلی لانے کا فیصلہ مارچ ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا۔ مئی جون کی چھٹیوں میں جامعہ کا سامان دہلی منتقل ہونے لگا اور جامعہ کا چھٹا تعلیمی سال جولائی ۱۹۲۵ء کو دہلی میں شروع ہوا۔

جامعہ کے دہلی منتقل ہونے پر بہت سے لوگ اس کی خدمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ جامعہ کو علی گڑھ ہی میں رہنا چاہئے۔ اور بعض مرے سے اس کے

جاری رکھنے ہی کے مخالف تھے، مگر پھر بھی بہت سے ایسے باہمت لوگ تھے جن کی وجہ سے جامعہ کا کام جاری رہا۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم جب تک زندہ رہے وہ ماہ بماہ جامعہ کے خرچ کا انتظام کرتے رہے۔ مولانا محمد علی کے الفاظ میں "طبیہ کالج حکیم صاحب مرحوم کی جوانی کی اولاد ہے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ بڑھاپے کی۔" اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ مرحوم ان دونوں اداروں کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جامعہ کے دہلی آنے پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے معتمد کے فرائض اپنے ذمہ لے لئے۔ وہ بھی جامعہ کے کاموں میں حکیم صاحب مرحوم کی مدد فرمانے لگے۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سی انتظامی تبدیلیاں ہوئیں۔ عبدالمجید خواجہ صاحب نے جامعہ کی بنیادوں کو ایک تعلیم گاہ کی حیثیت سے استوار کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں، اس کے احسان سے جامعہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنی قابلیت، اپنے وقت اور اپنے مال سب سے اس کمزور پودے کی آبیاری کی تھی، لیکن گوناگوں مجبوریوں سے وہ شیخ الجامعہ کے کام سے علیٰحدہ ہونا چاہتے تھے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں وہ جامعہ سے تشریف لے گئے۔ حسن محمد حیات صاحب جو کئی سال سے جامعہ کے مسجل تھے، دہلی نہ آسکے۔ ان دونوں حضرات کی جگہ طاہر الیس محمدی صاحب اور رشید الطہر صاحب کام کرتے رہے۔ عبدالمجید خواجہ صاحب کے سامنے ہی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب یورپ سے واپس تشریف لے آئے۔ وہ اپنے دو ساتھیوں ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے تھے۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب مسجل مقرر ہوئے۔ یہ دونوں جامعہ کے دوسرے کارکنوں کے ساتھ مل کر کچھ تجویزیں تیار کرنے میں لگ گئے۔ حکیم اجمل خاں صاحب تو ماہ بماہ جامعہ کے اخراجات کے لئے روپیہ دیا ہی کرتے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رہنمائی میں جامعہ کے کارکنوں نے بھی بڑے پیمانے پر چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ کام ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں صاحب دنیا سے رحلت فرما گئے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا تو جامعہ مقروض تھی۔ حکیم صاحب زندہ ہوتے تو اس کی ادائیگی

کا کوئی نہ کوئی انتظام کرتے ۔ جامعہ کے کام کرنے والے پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ کسی کے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کی سرپرستی کا فرض اپنے ذمہ لے لیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اپنے ساتھیوں کی ہمت بڑھائی۔ تب جاکر جامعہ کی کشتی مالی دشواریوں کے بھنور سے نکلی۔

جامعہ اپنے کارکنوں کی سرپرستی میں

فروری ۱۹۲۸ء میں جامعہ کے ہمدردوں اور حکیم اجمل خاں کے عقیدت مندوں کا دہلی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں طے پایا کہ حکیم اجمل خاں کی یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے "اجمل جامعہ فنڈ" قائم کیا جائے اور اس فنڈ میں آٹھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں تو جامعہ کے لئے عمارتیں بنوائی جائیں۔ جلسہ میں تو چودہ ہزار روپے کے وعدے ہوئے، لیکن بعد میں اس فنڈ میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ جامعہ میں چھٹیاں تھیں اور یہ سوال سامنے تھا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے یا جاری رکھا جائے۔ اگر کام جاری رکھیں تو قرضہ کا بوجھ اتارنے اور ایک سال کے اخراجات کا بار اٹھانے کے لیے ۵۵ ہزار روپے کی ضرورت ہے، یہ رقم کہاں سے لائی جائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کی تمام مالی کیفیت ایک خط کے ذریعہ من وعن امیر الجامعہ جناب ڈاکٹر انصاری مرحوم کی خدمت میں پیش کی اور ان سے یہ کہا کہ :

"مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے جلد از جلد حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اُسے حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو انصار جامعہ غیر معمولی سعی و کوشش سے مطلوبہ رقم فراہم کر دیں یا اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو اپنی طرف سے جامعہ کو بند کر دیں اور اس کے کام سے دستکش ہو جائیں۔ لیکن اس کو بند کرنے سے پہلے قوم کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اگر اس کام کو مفید سمجھتی ہے تو کوئی اور جماعت

اسے اپنے ہاتھ میں لے لے اور اسے چلائے۔ جامعہ کے اساتذہ میں کچھ لوگ ایسے یقیناً ہیں جنھوں نے اپنی عمر قومی تعلیم کے کام میں وقف کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ یہ لوگ شاید ملک کے بااثر اور دولت مند اشخاص میں کچھ ایسے لوگ تلاش کر سکیں جو اُن کے ارادوں سے محض ہمدردی ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کی تکمیل میں عملی حصہ لینے کو بھی تیار ہوں۔ امنارِ جامعہ اس کام کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیدیں تاکہ وہ اسے اپنی خواہش اور بساط کے مطابق جہاں تک چلا سکیں چلائیں۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے امنارِ جامعہ کے پاس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خط اور جامعہ کے مفصل حالات لکھ بھیجے۔ اپنے خط میں انھوں نے یہ تحریر کیا کہ: عو

"میں سمجھتا ہوں کہ ہم آئندہ سال کے مصارف اور پچھلے قرض کی ادائیگی کے لئے ۵۵ ہزار روپیہ جمع نہیں کر سکتے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو پھر ہم کیوں نہ صاف طریقے پر اس کا اعلان کر دیں کہ ہم جامعہ کو چلانے سے قاصر ہیں۔ ہمارا یہ اعلان کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو لیکن دیانت پر مبنی ہوگا، اور اگر ہم اس وقت ایسا نہ کریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہمیں مجبوراً ایسی کرنا ہوگا۔ ہر وہ شخص جو جامعہ کو ایک اہم قومی تحریک سمجھتا ہے اور جسے اس مفید کام سے کچھ قلبی تعلق ہے یہ اعلان نہ کرنا چاہے گا کہ جامعہ بند ہوگئی۔ میرا خود یہی جذبہ ہے میں ہرگز اس وقت کا خیال بھی کرنا نہیں چاہتا جب جامعہ نہ رہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے دستکش ہو جانے سے جامعہ کی موت لازم نہیں آتی بلکہ ممکن ہے اسی سے ہماری اس عزیز درس گاہ کے لئے نئی زندگی کا سامان ہو سکے۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے اس بارے میں مفصل گفتگو کی ہے کہ اگر ہم امنارِ جامعہ سے دست کش ہو گئے تو وہ کیا کریں گے۔ انھوں نے اپنے ارادوں کا جو خاکہ میرے سامنے پیش کیا ہے،

وہ عزم واستقلال کی قابل ستائش مثال ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اپنے ساتھیوں میں سے انجمن تعلیم ملی کے نام سے ان لوگوں کی ایک جماعت بنائیں جو ہر صورت میں قومی تعلیم کے کام کرتے رہنے کا عہد کرے۔ یہ جماعت اپنے اوپر دولت کا دروازہ بند کر لے اور صرف اس قدر اجرت پر جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہو ملی تعلیم کے کام کو انجام دے۔ یہ لوگ عہد لینا چاہتے ہیں کہ ایک مقررہ رقم سے زائد کبھی مشاہرہ نہ لیں گے۔ اور ان کا ارادہ یہاں تک ہے کہ جب تک جامعہ کے آئندہ مالی انتظامات نہ ہو جائیں یہ بالکل بلا معاوضہ کام کریں تاکہ جامعہ پر قرض کا بار نہ بڑھتا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اپنے خلوص اور ہمت سے بہت سے ساتھی اور مددگار پیدا کر لیں گے۔ اس لئے ہم اطمینان کے ساتھ جامعہ کے مستقبل کو ان کے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اس تحریر میں یہ بھی لکھا کہ:

"میں نے ۲۵ر جولائی ۱۹۲۸ء کو امنار کا ایک غیر معمولی جلسہ بلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ براہ کرم کل معاملہ پر اچھی طرح غور فرمالیجئے اور جلسہ میں شرکت فرما کر اپنی رائے سے فیصلہ میں مدد دیجئے اور شرکت نہ کر سکنے کی صورت میں تحریری رائے ضرور جلسہ سے قبل بھیج دیجئے۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے یہ خطوط ملت کے اکابرین کے نام روانہ کئے اور اِدھر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنے ساتھیوں کو جو چھٹیوں میں اپنے اپنے وطن گئے ہوئے تھے ایک ایک خط لکھا اور انھیں تمام حالات بتائے کہ "جامعہ مقروض ہے، روپیہ مفقود ہے، جامعہ کے بند کرنے کا سوال درپیش ہے، آپ اس کام کو یا اس کے کسی حصہ کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ کام کو جاری اس وقت رکھا جا سکتا ہے جب کہ آپ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور مشکلات سہنے کے لئے تیار ہوں۔" اکابر ملت اور جامعہ کے کارکنوں کے پاس یہ خط ساتھ ہی ساتھ بھیجے گئے تھے۔ امنار کی جماعت میں سے اکثر نے جواب ہی نہ دیا اور جنھوں نے جواب بھی دیا تو یہی کہ "کام چلنے والا

نہیں ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے، اسے بند کر دو۔" ان نوجوانوں نے جو جامعہ میں کام کرتے تھے یہی لکھا کہ ہم جامعہ کے کام کو جاری رکھیں گے اور جامعہ کی چلانے والی جماعت کا ہر شرط پر ممبر بننے کے لئے تیار ہیں۔ امنار جامعہ کا جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ جامعہ ملیہ کو اس کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے۔

جامعہ کے نوجوان کارکنوں نے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے جامعہ کو چلانے کے لئے ایک سوسائٹی تشکیل کی، جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ ۲۰ سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ طلب نہ کریں گے۔ پہلی دفعہ جن حضرات نے اس عہدنامۂ رکنیت پر دستخط کئے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (۲) پروفیسر محمد مجیب (۳) مولانا اسلم جیراج پوری (۴) مولانا خواجہ عبدالحی (۵) حافظ فیاض احمد (۶) ارشاد الحق (۷) برکت علی (۸) سعدالدین انصاری (۹) سعید انصاری (۱۰) شفیق الرحمٰن (۱۱) حامد علی خاں

عہدنامہ پر دستخط کرنے والوں کے علاوہ دوسرے اساتذہ نے بھی اپنی تنخواہیں کم کرالیں تاکہ جامعہ کا خرچ کم ہو جائے اور اس کے مالی انتظامات میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ خدا نے ان جواں ہمت نوجوانوں کے کام میں برکت دی، ان کی راہ میں مشکلات تھیں، انھوں نے عسرت و تنگی میں دن گذارے، مگر رفتہ رفتہ حالات بدلے قوم نے توجہ کی اور انھیں مالی اور اخلاقی مدد ملنے لگی۔ جامعہ کو والیانِ ملک اور مخیّر لوگوں سے غیر مشروط طور پر خاصی بڑی رقمیں ملیں، لیکن اس کا سب سے بڑا سہارا وہ چھوٹی رقمیں تھیں جو ہمدردانِ جامعہ سے وصول ہوتی تھیں، ان ہمدردوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی، ان میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، یہ لوگ جامعہ کی مدد اس وجہ سے کرتے تھے کہ ان کے دل میں جامعہ اور اس کے ملی اور تعلیمی مقاصد کی قدر تھی۔

قرول باغ سے جامعہ نگر

علی گڑھ سے جامعہ دہلی آئی تو قرول باغ میں کرایہ کی عمارتوں میں تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے ایک اچھی اور توسیع پذیر تعلیم گاہ کے لیے کرایہ کی عمارتیں نہ تو کافی ہو سکتی ہیں اور نہ شہر کی گنجان آبادی میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے کسی یونیورسٹی کا قیام مناسب ہو سکتا ہے، اس لیے جامعہ کے ارباب حل و عقد نے جامعہ کو شہر کے ہنگاموں سے دور ایسی جگہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا، جہاں ترقی و توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانات ہوں۔ اس لئے امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین، وغیرہ نے بہت غور و خوض کے بعد دہلی سے ۸، ۹ میل کے فاصلہ پر جنوب کی جانب دریائے جمنا کے قریب، اوکھلا گاؤں سے متصل ایک غیر آباد علاقے کو پسند کیا اور ایک قطعہ زمین خرید لیا گیا۔ یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو ایک عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ جامعہ نے اپنے کاموں اور منصوبوں میں ہمیشہ جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس موقع پر بھی عام رواج اور روایت کے برعکس عمارت کی بنیاد جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے نے اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے رکھی اور جلسے میں دلی کے معززین نے بہت بڑی تعداد میں شرکت کی، اس موقع پر مولانا اسلم جیراجپوری کی ایک نظم پڑھی گئی جس کا ہر لفظ دل سے نکلا تھا اور دل میں بیٹھ گیا، شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تقریر کی جس میں سچائی تھی درد میں ڈوبی ہوئی، جوش تھا متانت میں سمویا ہوا، عزم تھا عجز میں ملا ہوا، جامعہ کی مختصر تاریخ تھی، بانیانِ جامعہ کی یاد تھی، اہل جامعہ کو نصیحت تھی، ہمدردانِ جامعہ کا شکریہ تھا، سننے والوں کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو جوش گریہ گلوگیر تھا۔ امیر جامعہ نے جن الفاظ میں جامعہ کے استادوں اور کارکنوں کا ذکر کیا، وہ کسی افسر نے اپنے ماتحتوں کے متعلق، کسی جنرل نے اپنے سپاہیوں کے متعلق کم کہے ہوں گے۔ اعتراف، قدر دانی، ہمت افزائی، محبت شفقت

کے یہ کلمے ملک وملت کے ایک قائدِ جلیل کی زبان سے نکل رہے تھے اور جامعہ والے ادب، نیاز، ندامت، مسرت اور فخر کے جذبات دل میں لئے سر جھکائے سن رہے تھے۔" اس جلسے میں ترکی کی مشہور مجاہد خاتون خالدہ ادیب خانم بھی شریک تھیں، جو جامعہ میں " ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش " کے عنوان پر خطبہ دینے کے لئے تشریف لائی تھیں۔ انھوں نے بھی تقریر کی، "جامعہ کے مستقبل کی وہ تصویر دکھائی کہ تصور میں شاہدے کا لطف آگیا اور سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہوگیا، جس آواز نے سقاریہ کے میدان جنگ میں کڑک کر ترک سپاہیوں کو للکارا تھا وہ آج اوکھلے میں گونج کر جامعہ کے طلبہ کو ہمت اور جوش دلا رہی تھی کہ جامعہ کے نام اور اس کے پیام کی لاج رکھ لیں۔"

"قائدین ملک وملت کے ہمدردی کے پیام پڑھے گئے، مہاتما گاندھی، سر محمد اقبال، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر بھگوان داس کی مبارکباد اور دعائیں، اسمبلی کے کل ممبروں کی اپیل، دوسرے بزرگوں کی تہنیت اور تبریک۔ آخر میں چندوں کا اعلان شروع ہوا، جن کی میزان ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ ۵۰ ہزار کی مالیت کے ایک وقف کی خوش خبری سنائی گئی۔"[1]

اگلے سال، ۱۹۳۶ء میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو مدرسہ ابتدائی، جامعہ نگر کی اس نئی عمارت میں جو اگرچہ ابھی پوری طرح تیار نہیں تھی، منتقل ہوگیا۔

اس کے بعد ۲۱ مارچ ۱۹۳۹ء کو طلبائے قدیم کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے پہلے قدیم طالب علم کی حیثیت سے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"جب بھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ جامعہ بابت ماہ فروری ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۹۰

ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھاکر میں اہلِ جامعہ کو یاد دلاتا ہوں کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لیے قابلِ فخر نہیں ہے، اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی ہیں یا قید خانے۔ اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں ان کے مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں، اگر عمارتیں ہی مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ ہیں، جن سے حوصلوں، امنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے وقت میں نے کہا تھا کہ کہیں ہم لوگ عظیم الشان اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اپنے مقاصد کو نہ بھول جائیں، اگر ہم ایسا کریں تو آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ حق ہوگا کہ ہم کو ان عمارتوں سے دھکا دیکر نکال دیں اور ہمارے مقاصد اور ارادوں کے ان مقبروں کو گرا دیں۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ والے اس مقصد کو نہ بھولیں گے۔"

اس کے بعد ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو جامعہ نگر میں استادوں کے مدرسے کے لئے ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، سنگ بنیاد سے پہلے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے قائم مقام شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ایک تقریر کی۔ آپ نے فرمایا:

"جامعہ کی تعلیمی بستی کی ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جانے کو ہے اور جامعہ والوں کے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت میں آپ کے سامنے یہ بیان کروں کہ جامعہ والے جامعہ کا خیال دل میں لیے کہاں کہاں اور کس کس طرح رہے یا آپ کی نظر کو امید کا فریب دے کر بتاؤں کہ اس زمین پر جسے آپ اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں، جامعہ کی بستی کس طرح بسائی جائے گی اور کیسی عمارتوں کے نقشے ہمارے ذہن میں ہیں، آپ کو یہ سمجھاؤں کہ وہ مقصد کیا تھا جس کی خاطر جامعہ قائم کی گئی اور اس کی داستان سناؤں کہ یہ مقصد کس طرح اپنی صورت بدلتا مگر ہمیشہ ہمارے دلوں میں آباد رہا، یا یہ بتاؤں کہ جامعہ اپنی نئی بستی میں آباد ہوگی تو پھر جامعہ

کا مقصد اس بستی کو کس طرح رونق دے گا اور ہم اپنے اس نئے میدان عمل کو کیسے منصوبوں اور کارناموں سے سنواریں گے۔ جامعہ ایک ادارہ ہے اور اس حیثیت سے کوئی قدر رکھتی ہے تو وہ ایک ایسا خیال بھی ہے جو کہ بڑے سے بڑے ادارے میں سما نہیں سکتا اور جسے اپنی تخلیق قوت دکھلانے کے لئے قومی اور ملکی زندگی کا پورا میدان چاہئے، جامعہ والے ایک چھوٹی سی جماعت ہیں، مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بیکار ہو جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکی۔ اس خوشی کے موقع پر یہ ساری باتیں یاد آجاتی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ خوشی منانے کی جگہ خدا کے کرم نے جو کچھ عطا کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہم خدمت کا کوئی نیا ارادہ کریں۔ دنیا میں سبھی آرام کے لیے یا کام کے لیے عمارتیں بنواتے ہیں اور سب کی طرح ہمیں بھی نئی عمارت بننے پر خوشی ہوتی ہے، لیکن ہمیں اس کی بھی فکر کرنا ہے کہ ان عمارتوں میں کہیں ہم کو اتنا آرام نہ ملنے لگے کہ یہ قید خانہ بن جائیں، ان میں رہ کر ہم کہیں یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لیے بنتی ہے اور ہمیں اپنا کام اس طرح بڑھانا ہے کہ اس کے لیے کوئی عمارت کافی نہ ہو.....“

اگست میں نیا تعلیمی سال شروع ہوا تو اگرچہ یہ عمارت ابھی تک مکمل نہیں ہوئی تھی، مگر استادوں کا مدرسہ قرول باغ سے اس نئی عمارت میں اٹھ آیا اور دارالاقامہ اور تعلیم کے لئے دو عمارتیں کرایہ پر لے لی گئیں۔

اب جامعہ کے لوگوں کو اس نئی بستی کو جلد سے جلد آباد کرنے کی فکر ہوئی۔ موجودہ شکل میں، جبکہ جامعہ کے دو ادارے جامعہ نگر منتقل ہو گئے اور باقی ادارے قرول باغ میں تھے، بڑی دقتیں تھیں، اس کے علاوہ کرایہ کی عمارتوں کا بار بھی بہت کھل رہا تھا اس لیے اور عمارتیں بنوانے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کی گئی تاکہ دوسرے ادارے بھی جامعہ نگر

میں منتقل کر دیے جائیں۔ شفیق الرحمان قدوائی صاحب کی کوششوں سے جامعہ کے ہمدردوں کا پورے ملک میں جال سا بچھ گیا تھا اور ریاست حیدر آباد میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بہت سے دوست تھے جن کی کوششوں سے ۱۹۲۰ء میں ریاست حیدر آباد سے ۵۰ ہزار کی یکمشت اور ایک ہزار ماہانہ کی گرانٹ جاری ہوئی تھی۔ یہ لوگ اب مزید امداد کی کوشش کر رہے تھے، بالآخر کارکنان جامعہ کا صبر اور ایثار اور ان ہمدردوں کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۹۳۹ء کے وسط میں نظام حیدر آباد نے ایک لاکھ کا گراں قدر عطیہ دینے کا اعلان کیا۔

۳۵ء، ۳۶ء میں جو عمارت بنوائی گئی تھی اور جو مدرسہ ابتدائی کے استعمال میں تھی بالکل ویسی ہی اس کے مقابل میں دوسری عمارت بنوانے کی تجویز تھی، جس میں مدرسہ ثانوی کو منتقل کرنے کا پروگرام تھا۔ اس عمارت کے لیے نظام حیدر آباد کا ایک لاکھ کا یہ عطیہ کافی نہیں تھا، مگر ستمبر ۱۹۳۹ء میں مجلس عاملہ نے اللہ کا نام لے کر تیسری عمارت کی تعمیر کی اجازت دیدی اور بہت جلد اس کا کام شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صحت قابل اطمینان نہیں تھی، خاص طور پر بائیں آنکھ میں تکلیف رہ رہ کر اٹھا کرتی اور بڑی تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتی۔ سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں جب اس میں بڑی شدید تکلیف ہوئی تو دہلی کے ڈاکٹروں کے مشورے پر آپ بمبئی تشریف لے گئے اور مشہور ماہر امراض چشم ڈاکٹر کینی (Kenny) کا علاج کرایا۔ اس نے آپریشن کیا، دو ڈھائی ماہ کے علاج کے بعد شیخ الجامعہ صاحب واپس آئے تو آنکھ کی تکلیف جاتی رہی تھی، چنانچہ ۱۵ مارچ (۱۹۳۷ء) سے آپ نے باقاعدہ دفتری معمولات شروع کر دیے، لیکن ایک ہی سال کے بعد پھر تکلیف شروع ہو گئی، اور جولائی ۱۹۳۸ء میں آپ دوبارہ بمبئی تشریف لے گئے اور دوسری مرتبہ آپریشن کیا گیا۔ اگرچہ یہ آپریشن بھی پچھلے آپریشن کی طرح ڈاکٹروں کی اصطلاح میں کامیاب رہا، مگر تکلیف تھی کہ رہ رہ کر اٹھا کرتی، اس لئے اگلے سال جون میں علاج کے لیے ویانا تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے رفیق کار

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو جو خط لکھا وہ بہت دلچسپ ہے۔ ابتدائی حصّہ ملاحظہ ہو:

"۳؍ جولائی کو وینس پہنچا، شہر پسند آیا، وہیں رہ پڑا، دو دن کی جگہ دس دن وہاں رہ گیا، بہانہ یہ تراشا کہ اطالوی زبان سیکھ رہا ہوں، واقعی سیکھتا بھی تھا، لیکن سیکھنے میں جتنی دیر لگی بھلانے میں اس سے بہت کم لگے گی۔ ۱۸؍ جولائی کو وی آنا پہنچا..... ڈاکٹروں نے وہ معائنے کیے کہ معاذ اللہ! در گفتن نمی آید۔ قرار یہ پایا کہ آنکھیں اب جو کچھ ہیں ٹھیک ہیں، احتیاط رہے تو کام چلتا رہے گا۔ آنتیں البتہ بہت خراب ہیں، پرانی پیچش ہے اور خوب ہے، اس کی وجہ سے جگر بھی خراب ہے اور گردے بھی متاثر ہو چلے ہیں، زیادہ ڈھیل کی گنجائش نہیں، قاعدے سے تو حالت خراب ہونی چاہئے تھی، لیکن چونکہ یہاں سب کچھ بے قاعدہ رہا ہے اس لیے ابھی موقع ہے، علاج ہو سکتا ہے، خون کی جو حالت ہونی چاہئے تھی اس سے بہتر ہے، اس لیے علاج میں سہولت ہے۔ قلب بھی (سِتم ظریفی ملاحظہ ہو) پر چا ہے۔ دماغ کا معائنہ نہیں ہوا ورنہ شاید کچھ دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا....."

مگر بدقسمتی سے دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور بہ دقت تمام وہ ہندوستان واپس آئے۔ ۷؍ نومبر کو بغیر کسی اطلاع کے جامعہ نگر پہنچے اور جامعہ کے لوگوں کو اس وقت اطلاع ملی جب وہ دوسرے روز دفتر تشریف لائے۔

۱۹۳۶ء کے بعد ملک کے سیاسی حالات میں کافی تبدیلی آگئی تھی اور ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی کی رہنمائی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم تیار ہوئی تو اس کی وجہ سے جہاں مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقے نے جامعہ پر شدید اعتراضات کیے، وہاں ملک میں جامعہ کی شہرت بھی بڑھی اور اس کی حیثیت بھی قائم ہوئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صوبجاتی حکومتوں نے جامعہ کی سندیں دوسری منظور شدہ سندوں کے مساوی تسلیم کرلیں۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں یوپی کی حکومت نے جامعہ جونیر، سینیر اور سندی کی ڈگریوں کو حسب ترتیب

میٹرک، ایف اے اور بی اے کے مساوی تسلیم کرلیا، اسی سال جولائی میں حکومت بہار نے بھی جامعہ کی ڈگریوں کو تسلیم کرلیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس کے کئی برس بعد صرف جامعہ جونیر کو میٹرک کے مساوی تسلیم کیا۔

مدرسہ ثانوی کی عمارت تیار ہوگئی تو ۱۹۴۰ء میں تمام تعلیمی ادارے قرولباغ سے جامعہ نگر میں منتقل ہوگئے، قرولباغ میں صرف کتب خانہ، ادارۂ تعلیم و ترقی اور مکتبۂ جامعہ رہ گئے۔ ان کے علاوہ ایک مدرسہ ابتدائی بھی تھا، مگر یہ جامعہ کی اپنی عمارت میں تھا اور یہ غیر مقیم طلبار کے لئے شروع کیا گیا تھا، اس لیے اس کو قرولباغ سے منتقل کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، لیکن جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دلی میں فساد ہوا تو مکتبہ جامعہ کو جلا دیا گیا، مرکزی کتب خانہ اور ادارۂ تعلیم و ترقی لوٹ لیے گئے، اس لیے یہ ادارے بھی جامعہ نگر آگئے اور قرولباغ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ ایک ابتدائی اسکول جو غیر مقیم طلبہ کے لیے بنایا گیا تھا، ناسازگار حالات کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔

جشنِ سیمیں

۱۹۴۵ء میں جامعہ کے پچیس سال پورے ہو رہے تھے، اس لیے یکم مارچ ۱۹۴۶ء کو جشنِ سیمیں (سلور جوبلی) منانے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ فیصلہ ایسی حالت میں کیا گیا تھا جب کہ جامعہ کے پاس نہ پیسے تھے، نہ سامان تھا، اور نہ مہمانوں کو ٹھہرانے کے لیے معقول جگہ تھی، مگر لگن تھی، خلوص تھا، ایثار اور دوڑ دھوپ کرنے کا جذبہ تھا، مشکل سے مشکل مہم کو سر کرنے کا حوصلہ تھا اور سب سے بڑھکر یہ کہ ذاکر صاحب کی شخصیت تھی جس کا اثر غیر محدود تھا اور ان کے کچھ ساتھی تھے جو مایوس ہونا اور تھکنا جانتے ہی نہیں تھے اور چٹیل میدان کو گلزار بنانے کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ ان ہی "وسائل" پر بھروسہ کرکے جوبلی کا اعلان کر دیا گیا۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ میں اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کا احسان ہے کہ جامعہ کی عمر چند ماہ میں ۲۵ سال ہو جائے گی۔ دس پندرہ سال پہلے کسے امید تھی کہ ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا، اپنے کاموں کا جائزہ لینے اور انھیں آگے بڑھانے کے لئے انشاء اللہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی منائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ کے سب کارکن اور طالب علم اسی وقت سے اس جشن کی تیاری میں لگ جائیں گے، جو کام تکمیل کے منتظر ہیں انھیں محنت سے مکمل کرلیں گے اور نئے کام جو شروع کرنے ہیں، انھیں اچھی طرح سوچ کر شروع کرنے کے منصوبے تیار کریں گے۔ خدا کرے یہ جشن جامعہ کے لیے ایک نئی زندگی کا پیام لائے۔"

اس کے بعد قوم کے نام خط لکھا:

"۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کا وہ منظر آپ کی چشم تصور کے سامنے ہوگا جب خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے خانۂ خدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تھا۔ اس واقعے کو چوتھائی صدی گذر گئی، مسلمانوں کی قومی تحریک نے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے، بہت سے سیاسی اور تعلیمی ادارے بنے اور بگڑ گئے، لیکن جامعہ ملیہ سخت مشکلوں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی رہی، اب اس نے اتنی قوت حاصل کرلی ہے کہ اس کی شاخیں دور دور تک پھیلیں اور سارے ملک پر چھا جائیں، مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جامعہ ملتِ اسلامی کے سامنے جائزہ دے کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے اور اس سے ہدایت لے کہ آئندہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

"چنانچہ مجلس جامعہ ملیہ نے طے کیا ہے کہ آئندہ سال مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ سلور جوبلی کے نام سے ایک جشن کیا جائے، جامعہ کے قدیم طلبا، ہمدردانِ جامعہ اور وہ سب حضرات جو تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں جمع ہو کر جامعہ کے موجودہ اداروں اور شعبوں کا معائنہ کریں اور ان کی اصلاح اور ترقی

کی تدبیریں بتائیں اور ان کی ان تجویزوں پر جو جامعہ کے کام کی توسیع کے لیے پیش کی جارہی ہیں، غور فرمائیں، کچھ کام جو ہو رہے ہیں انھیں مکمل کیا جائے اور کچھ جو کرنے ہیں انھیں شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں خیال ہے کہ علوم اسلامی کا ایک تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمۃ کے نام سے قائم کیا جائے، ایک کتب خانہ کے قیام کا انتظام ہو جس میں اسلام اور ہندوستان سے متعلق تمام ضروری کتب کا ذخیرہ ہو، اعلیٰ پیمانہ پر ایک صنعتی مدرسہ کا کام شروع کیا جائے اور ایک لڑکیوں کے مدرسہ کی بناڈالی جائے، ان نئے اداروں کی عمارت کے علاوہ جامعہ کی نوآبادی کے لیے ایک جامع مسجد کی تعمیر نیز ایک شفاخانہ کا قیام ازبس ضروری ہے۔ کاش یہ سب کام جوبلی کے سلسلے میں کم سے کم شروع تو ہو جائیں، آپ کی توجہ سے کیا عجب ہے کہ ہم سال بھر کے اندر اتنا سرمایہ فراہم کرلیں کہ ان کاموں کا آغاز ہو سکے۔"

پہلے مارچ ۱۹۴۶ء میں جشن سیمیں منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اسی زمانے میں عام انتخابات ہوں گے، اس لیے مارچ کے بجائے نومبر میں ۱۵ر سے ۱۸ر تک منانے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ جوبلی جن نازک حالات میں ہوئی اور جس شان کے ساتھ منائی گئی وہ جامعہ سے تعلق رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ ملک کی سیاسی فضا اور فرقہ وارانہ تعلقات انتہائی خراب تھے، مگر پھر بھی جوبلی کی تقریبات بہت کامیابی کے ساتھ منائی گئیں اور بقول پروفیسر محمد مجیب صاحب "ذاکر حسین صاحب، کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے کہلوا سکے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ صحیح معنوں میں قومی سنستھا ہے۔" اس موقع پر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو خطبہ پڑھا اس کا حاضرین پر بہت گہرا اثر ہوا، لوگوں کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا اور بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، خود ذاکر صاحب کی آواز گلوگیر تھی (یہ خطبہ اس مضمون کے بعد ہی شائع کیا جارہا ہے)

ملک کی آزادی اور حکومت کی امداد

جامعہ کے بانیوں نے آزاد تعلیم کا بیج بویا تھا، جب یہ بیج بویا گیا تھا تو زمین شور تھی اور موسم ناموافق۔ خون پسینہ ایک کرکے اس کی آبیاری کی گئی تو بیج نے پودے کی شکل اختیار کی، مگر کمزور تھا اور بڑھوتی کی رفتار کافی سست تھی۔ جامعہ کے کارکن اس امید پر اس پودے کی دیکھ بھال کر رہے تھے کہ ملک کی آزادی کے بعد موافق فضا ملے گی اور یہ کمزور پودا بہت جلد تناور درخت کی صورت اختیار کرے گا، مگر ملک کی آزادی ایسی شکل میں آئی، جس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ جامعہ کی آمدنی کا قابل اعتماد ذریعہ عوام کے چندے تھے اور تقسیم کی وجہ سے عوامی زندگی ایسی اتھل پتھل ہوگئی کہ یہ ذریعہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ اب جامعہ کے اخراجات اس سرمایے سے پورے کئے جا رہے تھے جو جوبلی کے موقع پر عوام، والیان ریاست اور حکومت سے ملا تھا۔ مگر تابکے ؟ اب جامعہ کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی سوائے اس کے کہ حکومت سے امداد لی جائے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جامعہ نے حکومت سے امداد نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے حکومت سے کسی قسم کی امداد لینا اس فیصلے کی خلاف ورزی ہوگی۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ ہم نے بیرونی حکومت سے امداد نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، یہ قومی حکومت ہے، خود ہماری بنائی ہوئی، اس سے امداد لینے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ اور اس کے علاوہ جامعہ کو اگر زندہ رکھنا اور ترقی دینا ہے تو اس کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں ہے۔ دوسری طرف ملک کے محبوب رہنما اور حکومت کے ہردلعزیز وزیر اعظم پنڈت نہرو نے نہ صرف امداد کی پیش کش کی بلکہ اس کو قبول کرنے پر اصرار بھی کیا۔ چنانچہ انجمن جامعہ ملیہ نے بہت غور وخوض کے بعد اس کو قبول کرنے کی اجازت دی۔ اجازت مل گئی اور حکومت سے امداد بھی ملنے لگی مگر اس سلسلے میں جو دلچسپ تجربے ہوئے، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے خطبۂ جشن زریں سے کیا جا سکتا ہے، جو اسی اشاعت میں

درج ہے۔

جامعہ کے نئے رہنما، پروفیسر محمد مجیب صاحب

ملک کی آزادی کے بعد جامعہ کو نئے حالات اور نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور ابھی ان پر پوری طرح قابو حاصل نہیں ہوا تھا کہ نومبر ۱۹۴۸ء میں، وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے اصرار اور جامعہ کی اجازت سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب علی گڑھ تشریف لے گئے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب، جو اس وقت نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی وجہ سے کارکنان جامعہ کو بڑا اطمینان تھا، وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے بغیر جامعہ چل سکے گی، مگر ذاکر صاحب کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسے لائق اور ایثار پسند ساتھی ملے تھے، جن پر انھیں پورا اعتماد تھا کہ جامعہ ان کی رہنمائی میں ترقی کرے گی اور قوم و ملک کی بہتر طور پر خدمت کر سکے گی۔

مجیب صاحب کے دور میں سب سے بڑی آسانی یہ رہی کہ انھیں جامعہ چلانے کے لئے چندے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ حکومت کی امداد اور جامعہ کی ڈگریوں کی منظوری کے بعد اس کی ترقی کے دروازے کھل گئے اور جامعہ کو جو ابھی تک صحیح معنی میں یونیورسٹی نہیں تھی، ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی دفعہ ۳ کے تحت باقاعدہ یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اب یہاں اداروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، پہلے صرف مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی، کالج اور استادوں کا مدرسہ تھے، اور اب ان کے علاوہ نرسری اسکول، بالک ماتا سنٹر، شعبۂ انجینرنگ اور اسکول آف سوشل ورک کھل گئے ہیں اور ایک عرصے سے کام کر رہے ہیں۔ بی ایس سی، ایم اے، ایم ایڈ اور پی ایچ ڈی کے نصابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے صرف تین بڑی عمارتیں تھیں، مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی اور استادوں کے مدرسہ کی،

اب یہاں دنیا ہی بدل گئی ہے، استادوں کا مدرسہ، کالج اور لڑکیوں کے لئے ہوسٹل بن گئے ہیں، آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے لئے ایک عمارت بنوائی گئی ہے، جس میں تعلیم بھی ہوتی ہے اور طالب علم بھی رہتے ہیں، کالج کے لئے، ہوسٹل کے علاوہ، دو عمارتیں بنی ہیں، ایک میں تعلیم ہوتی ہے اور ایک میں دفتر، لائبریری اور لیبوریٹری ہے، ایک اور عمارت ہے جس میں مدرسہ ثانوی اور مدرسہ ابتدائی کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کی صرف ایک منزل تیار ہوئی، دوسری منزل باقی ہے۔ اسی طرح مرکزی دفاتر کے لئے ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ ان کے علاوہ ایک اوپن ایر تھیٹر ہے، ایک ورکشاپ ہے، اسٹاف کے لئے بہت سے کوارٹرز ہیں اور شعبۂ انجینرنگ اور اسکول آف سوشل ورک کی تعلیم کے لئے اور طلبار اور اسٹاف کے رہنے کے لئے الگ عمارتیں ہیں۔ اس وقت دو عمارتیں اور ایک مسجد زیر تعمیر ہیں۔ مرکزی کتب خانہ کے لئے بڑی شاندار عمارت بن رہی ہے، جو عنقریب قریب مکمل ہو چکی ہے، جشن زریں کے زمانے میں اس کے کچھ حصے استعمال کے لئے مل جائیں گے، دوسرے جامعہ کالج کے سائنس بلاک کی عمارت زیر تعمیر ہے، دیواریں کافی اونچائی تک بن گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پچاس سال سے جامعہ میں کوئی مسجد نہیں تھی جشن سیمیں کے موقع پر اس کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تھا، مگر ظاہر ہے یہ صرف مسلمانوں کے عطیوں سے بنائی جا سکتی ہے اور بدقسمتی سے انھوں نے جامعہ کی اس اپیل کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی تھی۔ اس مرتبہ اللہ کا نام لے کر اس کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ چھت تک اس کی دیواریں تیار ہو گئی ہیں، کوشش جاری ہے کہ جلد ہی چھت بھی پڑ جائے۔

یہ تو تصویر کا ایک رُخ ہوا جو حقیقتاً بڑا شاندار ہے، مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا دور تکلیفوں اور مشکلوں سے خالی ہے۔ اس کی دشواریوں کی نوعیت مختلف ضرور ہے، مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ پریشانیوں سے چھٹکارا مل گیا ہے اور اب اطمینان قلب حاصل ہو گیا ہے۔ پہلے وہی اساتذہ اور کارکن آتے تھے جن کو جامعہ سے قلبی لگاؤ اور اس کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی ہو، کیونکہ یہاں جو کچھ ملتا تھا وہ برائے نام

تھا اور محنت بہت کرنی پڑتی تھی، مگر اب مرکزی یونیورسٹیوں کے مطابق تنخواہیں ملتی ہیں اور اساتذہ و کارکنوں کو رائج قاعدوں کے مطابق منتخب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بازار میں اس کی ڈگریوں کی وہی مانگ ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کی ہے، اس لئے ایسے طالب علم زیادہ آتے ہیں، جنھیں علم اور تہذیب سے زیادہ ڈگریوں کی طلب ہوتی ہے۔ اب مجیب صاحب کا کام یہ ہے کہ ان اساتذہ اور طلبا کو جامعہ کے مخصوص ماحول کے مطابق بنائیں، ان میں یہ احساس پیدا کریں کہ صرف پیٹ ہی نہیں ہے، ملک و قوم کی خدمت بھی ایک اہم کام ہے، صرف کسی طرح زندگی گذار دینا ہی کافی نہیں ہے، جو زندگی شرافت، انسانیت، رکھ رکھاؤ اور تہذیب سے خالی ہو، وہ کوئی زندگی نہیں۔ یہ کام بہ ظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، نصیحت کرنا، اپدیش دینا کوئی مشکل کام ہے، لیکن جس کے پیش نظر ایک خاص مطمح نظر ہو، ایک مشن ہو اور جو اعلیٰ اقدار کا پرستار ہو، موجودہ دور میں اس کے دل کی کیفیت کیا ہو گی، اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔

شیخ الجامعہ صاحب کی وہ تقریریں اور رپورٹیں میرے سامنے ہیں جو یوم تاسیس کے جلسوں، انجمن کے جلسوں اور تقسیم اسناد کے جلسوں میں انھوں نے پڑھی ہیں۔ اگر اس مضمون کے طویل ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ان کے متعدد ایسے اقتباسات پیش کرتا، جن سے معلوم ہوتا کہ ان کا مشن کتنا مشکل اور کتنا اہم ہے، اس لئے صرف ۵۸-۱۹۵۷ء کی رپورٹ سے جو انجمن جامعہ میں انھوں نے پیش کی تھی، دو اقتباسات پیش کرتا ہوں:

> "ملک کی تعلیم کو اس وقت دو باتوں سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ استاد کو اس ادارے سے لگاؤ نہیں ہوتا جس میں وہ کام کرتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ طالب علم اور استاد اور طالب علم اور ادارے کے درمیان خیر خواہی اور محبت کا رشتہ قائم نہیں ہوتا۔ استاد سمجھتے ہیں کہ انھیں ان کی خدمات کے بدلے میں تنخواہ ملتی ہے اور اگر انھیں انفرادی یا اجتماعی طور پر خیال ہو جائے کہ انھیں تنخواہ کم ملتی ہے یا وہ ملازمت کے کسی حق سے محروم کئے گئے ہیں تو وہ کام میں جی لگانا چھوڑ دیتے

ہیں یا ان کی ساری توجہ تنخواہ بڑھوانے یا حق کو وصول کرنے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ طالب علموں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، استاد کچھ اس تعداد کی وجہ سے ذاتی واقفیت پیدا کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں، کچھ بے پروائی بھی برتتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تعلیم کی حیثیت ایک معمول کی سی ہو گئی ہے جسے پورا کرنا کافی سمجھا جاتا ہے اور علم حاصل کرنے کے شوق سے اسے کچھ زیادہ نسبت نہیں رہ گئی ہے۔"

"جامعہ کے اساتذہ کے لیے مصلحت اندیشی اور یکجہتی اس وجہ سے اور بھی لازمی ہو گئی ہے کہ بیشتر نوجوان جو اب تعلیم کے لیے آتے ہیں ان کا جامعہ کے تہذیبی نصب العین سے کوئی روایتی تعلق نہیں ہے، ہم جس تہذیبی ورثے کو ملک کے نوجوانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں، ان کی قدر پہچاننے کے لیے ہمارے اخلاق اور ہمارے ذوق و شوق کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا ہے اور اگر ہماری جماعت کے اندر مخالفتیں پیدا ہو گئیں یا ہم نے اپنے طرز عمل سے ظاہر کیا کہ ہم اعلیٰ اصولوں کی پابندی کرنے کی توفیق نہیں رکھتے تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ ہم میں بھی اتنی ہی کھوٹ ہے جتنی کہ رائج سکے میں ہوا کرتی ہے اور کوئی ہمیں پرکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرے گا۔"

جشن چہل سالہ

۱۹۶۰ء میں جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا۔ جشن چہل سالہ کی رسم تاریخ میں بالکل نئی بات ہے۔ روایتوں کے مطابق جشن سیمیں (سلور جوبلی) منایا جاتا ہے، جشن زریں (گولڈن جوبلی) منایا جاتا ہے اور جشن الماس (ڈائمنڈ جوبلی) منایا جاتا ہے، مگر جامعہ میں کوئی کام اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ایسا لوگ کرتے ہیں، اس کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، بڑا مقصد، عظیم مقصد۔ جشن چہل سالہ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ حکومت اور ملک و قوم کو جامعہ کی ضروریات کی طرف متوجہ کیا جائے اور اس کے بعض نامکمل منصوبے پورے

کئے جائیں۔ اس موقع پر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے تین خطبے پڑھے تھے، ایک جلسۂ افتتاحیہ میں جس میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی نے شرکت کی تھی، دوسرا اس وقت پڑھا گیا جب پرنس مکرم جاہ نے نمائش کا افتتاح کیا تھا اور تیسرا جلسۂ خاص میں پڑھا گیا تھا، جس کی صدارت پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کی تھی۔ تیسرے خطبے کے دو طویل اقتباسات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں، جن سے جشن چہل سالہ کے مقصد کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"جامعہ کی بنیاد چالیس برس ہوئے، اس یقین کے ساتھ رکھی گئی تھی کہ ہندوستان آزاد ہوگا اور سچی قومی تعلیم ہماری جنتا میں ایک نئی جان ڈال دے گی۔ ہماری امیدیں پوری ہوگئی ہیں، ہندوستان آزاد ہے، ہماری تعلیم بالکل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آج ہم جامعہ ملیہ کے کام کرنے والے، جامعہ کی چالیسویں سال گرہ منارہے ہیں، ہمارے راشٹرپتی، جن سے ہمارا بہت پرانا تعلق ہے، ہم میں تشریف رکھتے ہیں، ہم میں ایسے لوگ ہیں جو جامعہ کی خدمت اس وقت سے کر رہے ہیں جبکہ وہ قائم ہوئی تھی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ یہاں گذارا ہے، ہم میں بہت سے لوگ نئے حوصلے لیکر شامل ہوئے ہیں۔ جامعہ بڑھتی رہی ہے، بدلتی رہی ہے، اس کے مقاصد پر اب بھی بحث ہورہی ہے۔ یہ بحث اس کی علامت ہے کہ وہ لوگ جو خود اس کے مختلف کاموں کو انجام دے رہے ہیں اور وہ جو کسی نہ کسی طریقے پر ان میں شریک ہوتے رہتے ہیں، جامعہ کے مقاصد سے صحیح قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بے شک یہ ہمارے لئے خوشی اور شکر گذاری کا موقع ہے۔

"جامعہ کے بہت سے بانی تھے، مولانا محمود الحسن، مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی۔ ہم کو اس پر فخر کرنا چاہیئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جامعہ کا وجود بہت سے عقیدوں اور تمناؤں کا سنگم، ممتاز

مفکروں اور ملک کے رہنماؤں کے درمیان قدر مشترک تھا۔ جو اسے نام دیا گیا اس سے اس کے منصب کے تین پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، یعنی یہ کہ جامعہ ایک آزاد تعلیم گاہ ہوگی وہ شہریت کے نصب العین کو طرح طرح سے سامنے لاتی رہے گی اور وہ اعلیٰ دینی اور روحانی سرچشموں سے ہدایت حاصل کرے گی، ہم نے جامعہ کے منصب کے تینوں پہلوؤں کو ایک عملی، محسوس شکل دینے کی کوشش کی ہے، ہم آزاد رہے، شہریت کے تصور کو واضح کرتے رہے اور دین کی پیروی کے معنی سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ مہاتما گاندھی نے سب سے پہلے ہندوستان کی تعلیم میں آزادی کو معیار قرار دیا اور انھیں کو اس پر بہت اصرار تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک اسلامی ادارہ ہو، ہمارے لیے یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا، وہ اسے خالص عقلی نقطۂ نظر سے صحیح مانتے تھے، ہم نے یہ تو مان لیا کہ جامعہ کو نام اور منصب کے لحاظ سے ایک اسلامی ادارہ ہونا چاہیئے، مگر ہمیں اپنے دلوں سے اس تنگ نظری اور تعصب کو نکالنے میں دشواریاں پیش آئیں جو سارے ملک میں ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا، دین کے خالص سرچشموں سے ہدایت، ہمت اور خود اعتمادی حاصل کرنے اور اپنے کام اور اپنے معاملوں میں اس کی ترجمانی کرنے میں بھی ہماری بڑی سخت آزمائش ہوئی۔ ہمارا ہر قدم صحیح نہیں پڑا، ہم بالکل سیدھے آگے نہیں بڑھ سکے، لیکن منزل کبھی ہمارے دل سے دور اور نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔ اس خیال سے ہمیں بہت سہارا ملا کہ گاندھی جی ہم کو اور ہمارے کاموں کو محبت اور اعتماد کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، وہ ہماری غلطیوں کو مسکرا کر معاف کر دیں گے اور انھیں امید رہے گی کہ جو کچھ ہم آج نہیں کر سکتے وہ کل ضرور کریں گے۔ دو مرتبہ انھوں نے ہمیں ڈوبنے سے بچایا، کبھی ہم نے ٹھوکر کھائی، کبھی راستے سے بھٹک گئے، مگر جو جھنڈا انھوں نے ہمارے ہاتھ میں دیا تھا اسے ہم آج بھی لہرا رہے ہیں۔"

"اب یہ سوال اٹھا ہے کہ جامعہ جس مقصد سے قائم کی گئی تھی، اس نے جو تعلیمی کام کیا

ہے اور اب بھی کر رہی ہے، ہنر اور استعداد کے جس تصور کا اس نے پرچار کیا ہے، اس کا وہ مسلک جس نے اسے ملک میں دوستی اور یگانگت کی علامت بنا دیا ہے، اسے اس کا مستحق کر دیتا ہے یا نہیں کہ اسے مختلف درجوں کی اعلیٰ تعلیم کا بڑے پیمانے پر انتظام کرنے کے لیے وسائل دیے جائیں۔ تعلیم کا بہرحال یہ مقصد ہوتا ہے کہ نوجوانوں کو کام اور روزگار کے لیے تیار کرے اور یہ بات اچھی ہو یا نہ ہو، ملازمت اسی کو ملتی ہے جس کے پاس مناسب ڈگری ہو۔ جامعہ اپنے وسائل سے فائدہ نہ اٹھا سکے گی جب تک کہ اسے پارلیمنٹ قانون کے ذریعہ ڈگری دینے کا اختیار عطا نہ کرے۔
ایک اور سوال اس زمانے میں اٹھا ہے کہ جامعہ کو یونیورسٹیوں کی طرح ہر مضمون کی تعلیم دینا چاہیے یا اعلیٰ تعلیم میں اپنے لیے کچھ مضمون مخصوص کر لینا چاہیے۔ ایک کمیٹی نے، جس کے صدر جسٹس ایس آر داس تھے، یہ سفارش کی ہے کہ جامعہ کا کام محدود نہ ہو، کیونکہ کام محدود ہو جانے پر بہت سے طالب علم جو روزگار کے لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں، یہاں نہ آسکیں گے اور جامعہ تعلیمی دنیا سے کٹ کر الگ ہو جائے گی۔ گویا کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ جامعہ قومی اہمیت رکھنے والا ادارہ بننے کی خاطر اپنے دستور اور مقاصد میں تبدیلی نہ کرے اور یہ بات مناسب ہے، کیونکہ سماج سے الگ رہنے کی خواہش ہمیں نہ پہلے کبھی تھی اور نہ اب ہے۔ جامعہ میں استاد اس وجہ سے آئے کہ وہ اپنے آپ کو آزادی اور مساوات کی حوصلہ پرور فضا میں تعلیم کے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے اور اگر تنخواہیں بڑھ گئیں اور وسائل مہیا ہو گئے تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ جو مقاصد ہمیں اب دل سے عزیز ہیں وہ بے اثر ہو جائیں، آزادی اور مساوات کے وہ نشے جو ہماری طبیعتوں میں سرایت کر گئے ہیں خار کی طرح دور ہو جائیں۔ اب بھی ہم ہرا دل ہیں، اب بھی ہم احتیاط کی وضع کو چھوڑ کر، نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہو کر نئے کام شروع کرتے ہیں۔ آپ جس طرف بھی

دیکھئے اور خاص طور سے دل کی ان وسعتوں میں جہاں اب تک محبت اور مروّت کی صدائیں نہیں گونجی ہیں، ہمیں آپ آگے بڑھتے دیکھیں گے۔ ہم کہتے ہیں کہ جامعہ کا نام اسلامی ہے اور سیرت اسلامی تو اس سے مراد یہی سب کچھ ہوتا ہے، ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ کر کسی حق کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں، ہم تو اس کا اعلان کرتے ہیں کہ جو ضروری اور مفید کام کوئی اور نہ کرے وہ ہم کریں گے۔ دل کی گہرائیوں سے جو موتی دوسرے نہ نکال سکتے ہوں، انھیں ہم نکال لائیں گے، ہم مذہب اور تہذیب کے ذریعے وہ رشتے قائم کریں گے جو ایک دوسرے کا مزاج شناس، ہمدرد اور دوست بنا دیتے ہیں اور احترام، خلوص، سچائی کے نغموں سے لطف اور محبت کی فضا پیدا کریں گے جس میں ہنر پرورش پائے، اخلاق کا حسن اپنے جلوے دکھائے اور ہندوستان کے مستقبل کی روشنی آنکھوں کا نور بن جائے۔"

پیش کردہ
خلیق انجم

جشن زریں

جشن چہل سالہ کے دس سال کے بعد اب جامعہ کا جشن زریں (گولڈن جوبلی) منایا جارہا ہے۔ پچھلے دس برسوں میں ملک کے حالات اور تعلیم کے میدان میں بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، کچھ مسائل حل ہوئے ہیں تو کچھ نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور کچھ مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص اور جامعہ کے ہمدرد اکٹھا ہوں، جامعہ کی ترقی اور کاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور مشکلات کی کہانی کو اس شخص کی زبانی سنیں جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بعد جامعہ کی رہنمائی سپرد کی گئی تھی اور جو ذاکر صاحب کے قدیم ساتھیوں میں سے ہے۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حکومت کی امداد سے جامعہ میں بہت کافی توسیع ہوئی اور ترقی و توسیع کے بہت سے منصوبے اس وقت سامنے ہیں، ان میں سے سب سے اہم منصوبہ علوم اسلامی کے سنٹر کا قیام ہے، جو مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی یادگار کے

طور پر قائم کیا جائے گا اور ابتدائی اور ضروری اخراجات کے لئے حکومت نے تین لاکھ کی کی رقم منظور بھی کردی ہے۔ اس سنٹر کے قیام سے جامعہ کے لیے ایک خاص میدان میں کام کرنے کے بہترین مواقع ملیں گے۔ مگر اس کو نہیں بھولنا چاہئے کہ حکومت کی امداد کا ایک خاص نہج ہوتا ہے اور وہ آسانی سے اپنی ڈگر سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، ملت اسلامیہ اگر چاہتی ہے کہ جامعہ ایسے کام بھی کرے، جن کا خاص طور پر صرف مذہب اسلام اور ملت اسلامیہ سے تعلق ہے تو اس کی ذمہ داریوں میں اسے بھی شرکت کرنی ہوگی اور اگر پورا نہیں تو کچھ بوجھ اسے بھی اٹھانا چاہیئے۔ امید ہے کہ جشن زریں کی وجہ سے اس قسم کے مسائل اور امور پر غور کرنے اور مشورہ کرنے کا بہترین موقع ملے گا۔

اس مضمون کے صفحہ ۴۳ تک کے حالات اور واقعات جامعہ کی تاریخ سے لیے گئے ہیں، جو جشن سیمیں کے موقع پر کتابی صورت میں شائع کی گئی تھی۔ اس کے بعد کے حالات و واقعات راقم الحروف نے لکھے ہیں، جن کی صحت اور الفاظ و بیان کی ذمہ داری صرف مجھ پر ہے، اس لیے اگر کوئی واقعہ ذکر سے رہ گیا ہو تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

تقریر شیخ الجامعہ

(بہ تقریب جشن سیمیں منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء)

یہ تقریر جامعہ کے جشن سیمیں کے خاص جلسے

میں، جو ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء کو زیر صدارت

اعلیٰ حضرت جناب نواب صاحب بھوپال منعقد

ہوا، پڑھی گئی۔

اعلیٰ حضرت، محترم امیر جامعہ، خواتین اور حضرات!

آج مجھے آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچیس سالہ روئداد کا خلاصہ پیش کرنا ہے۔ پچیس سال اور کیسے پچیس سال! یہ کام جب شروع ہوا تھا تو کتنے تھے جن کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس پر پچیس سال بھی گذر جائیں گے؟ خاصی طویل مدت ہوتی ہے پچیس سال کی، اور پھر قوموں کی زندگی میں یہی پچیس سال ایک لمحہ سے بھی کم ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اپنی طوالت کے یہ زمانہ بے رنگ مرور کا مرادف بھی ہو سکتا ہے، اور حیات قومی کا یہی ایک لمحہ ایک تخلیقی لمحہ ہونے کی وجہ سے صدیوں پر بھاری بھی ہو سکتا ہے۔ ان گذرے ہوئے پچیس سال کی روئداد کس اسلوب سے پیش کروں؟ اس مدت میں عزائم اور فسخ عزائم، ولولوں اور پژمردگیوں، مشقتوں اور سہل انگاریوں، دل بستگیوں اور دل شکستگیوں، شبہوں اور اعتمادوں، امیدوں اور مایوسیوں، تھپکیوں اور گھڑکیوں، حوصلہ مندیوں اور

درماندگیوں کی کیسی کیسی مثالیں سامنے آئی ہیں؟ اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف برائے گفتن نہیں، ان میں سے سب کی مثالیں اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اسی لئے میں ان کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہوجائے گی، خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمت قومی کا کوئی کام نیک نیتی سے، خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دست گیری فرماتا ہے، متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے، دل توڑا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے۔

دل شکستہ در آں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا، شرط یہ ہے کہ عسر کو اس کی رضا جوئی میں جھیلا جائے اور یسر کو اسی کی راہ میں پیش قدمی کے لئے سہولت اور مرحمت جانا جائے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کردوں۔ آپ سب کو یاد ہوگا، اس لئے کہ باوجود حافظہ کی معروف ناپائیداری کے وہ آسانی سے بھلا سکنے کی بات نہیں، کہ کوئی دس سال کی انتہائی ہیجانی اور تلاطمی بےچینی کے بعد ۱۹۲۰ء میں مسلمانان ہند کی ایک عمومی حرکت نے تحریک خلافت کی شکل اختیار کی۔ ساری دنیا میں ملت اسلامی پر جو گذر رہی تھی اس سے ہندوستان کے مسلمان بے خبر اور غیر متاثر نہ تھے، اپنی جماعتی حالت کی زبونی سے بھی، باوجود صد غفلت، یہ آنکھیں بند نہ کرسکتے تھے، مایوسی بھی تھی، غصہ بھی تھا، اور بے ہاتھ پاؤں مارے اپنے خاتمہ کا خیر مقدم کرنے کو بھی یہ تیار نہ تھے، کہ جسم جماعتی میں ابھی کہیں زندگی کی رمق باقی تھی، اور جس طرح کسی شدید مرض کے حملے میں جسم اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر ایک بار دفع مرض کی جان توڑ کوشش کرتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ ہندیہ نے اپنی ساری ناتواں توانائیوں کو مجتمع کرکے صورت حال کے مقابلہ کا تہیہ کیا تھا۔ جس طرح جسم کے سارے

نظام ہائے اعضا، اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اس کی اس معیت میں آخری معرکہ کے لئے کمربستہ ہوکر، کتابوں اور حکیموں کے اندازوں سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں اسی طرح جسم اجتماعی کا حال ہوتا ہے۔ اس تلاطم کے زمانے میں مسلمانان ہند نے اسی قسم کی ایک کوشش کی تھی۔ تعلیمی نظام اعضار کے فعل کا نتیجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔

تعلیم کے کام کا پرسکون دھیما پن اور ایک انقلاب انگیز سعی ملی کی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دورِ انقلاب میں جامعہ کے نام سے ان تمام نیم شعوری اور تحت شعور تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی جو ایک عرصے سے مسلمانوں کے اہل فکر وعمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظام کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سید احمد خاں کی آرزوؤں، سید محمود کی تجویزوں، وقار الملک کے ارادوں، اعلیٰ حضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیموں، غرض خدمت اور احیار ملت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفۂ بنیادی سے غافل نہیں ہے، اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رکھنے اور ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اُسے تعلیم، صحیح تعلیم، ہی کی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ، جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہوچکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمان جس عالمگیر ابتلا میں رہے، اس میں انھوں نے جامعہ ملیہ قائم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن بس رمق زندگی کا۔ یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار ہسٹریا جیسے تشنجی ہنگاموں میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزل مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزینۂ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش وخروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلسوں میں منتشر نہ کردے بلکہ صبر طلب وصبر آزما تعمیری مساعی میں اسے

برسوں، قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلانا سیکھے۔ میں نے کہا یہ جامعہ ثبوت ہے اور سبق۔ البتہ بہت ہی کمزور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق۔ کیا عجب ہے کہ تائید ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دل نشیں بنا دے۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جامعہ میں احیار ملی کی بہت سی تعلیمی تجویزوں کا سنگم ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم ومغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح۔ عجیب زمانہ تھا وہ، صاحبو۔ نشۂ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جرمانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے۔ خودغرضیوں کی ہر وقت جکڑے رکھنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی، سفارشوں کے لئے سرگرداں، اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لئے وقف کر دیں لیکن عمر بھر خودغرضی کی تکرار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس بے غرضی کا رخ بھی جاذب توجہ ہنگاموں کی طرف، گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف، تقریروں کی طرف، نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور اس خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے، اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس، قید، جلاوطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی

کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو، یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرمار ہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ زیادہ عزیز تھی، وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا، ۲۹ر اکتوبر، ۲۰ء کو۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل ودماغ رکھنے والے وابستہ رہے: حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی مرحوم پہلے شیخ الجامعہ۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری، خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں، اور ان کی نظر حال کی ترقیوں کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دلفریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے، تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت بھی ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر مولانا محمد علی اس عہد کی ان غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بیتابی بھی ارزانی فرماتی ہے، ان کا ذہن انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جامعہ کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانۂ فرزانہ کی شاگردی اور ہم رکابی کا شرف بھی حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم برہم کر دیں۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمیِ قلب ملی جو مایوسیوں میں امیدوار، اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے، اور اگرچہ بے سروسامانی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پاکر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے ہم پر ترس کھایا اور زبان حال سے فرمایا:

به سادگی تو رحم آمدم درین بازار
که تنگ دستی و امیدوار می گزری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دلِ شکستہ و ویران کی قدر کرنا سکھا دیا تھا، اور ہم بھی عرفی ہی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ:

عرفی دل آباد بہ یک جو نہ خرد عشق
من ہم دل ویراں بہ دو عالم نہ فروشم

لیکن مولانا محمد علی زیادہ دن جامعہ میں نہ رہ سکے تھے کہ سیاست نے انھیں پھر طلب کیا، اور ہمارے ملک میں تو سیاست کا انعام اکثر قید و بند اور دار و رسن کی شکل میں ہی ملتا رہا ہے۔ کراچی کے مشہور مقدمہ کے بعد مولانا قید کر لیے گئے اور ہمارے کام کی باگ عبدالمجید خواجہ صاحب نے سنبھالی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے آج ہم میں موجود ہیں، اور میں جامعہ کے تمام کارکنوں کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ ان کی رہنمائی نے جامعہ کو اس ڈھنگ پر جما دیا جس پر وہ آج تک چلتی رہی ہے۔ خواجہ صاحب نے جامعہ کے خالص تعلیمی مشن کو سب سیاسی کام کرنے والوں

سے موڑا یا، اور جامعہ نے تہیہ کیا کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت سے کرے گی، اور اس میں تعلیمی آزادی کو بطور اصول بنیادی کے ہمیشہ پیش نظر رکھے گی۔ اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول، سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلق، آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کاموں میں موخر الذکر کی اہمیت کا اقرار، یہ ہمیشہ کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے۔ اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یکسوئی سے اس پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی، ان کی نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر، مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست، خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالا ہے، آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اُتر جاتا ہے، تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست استحکام وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بیتاب؛ تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے، لازماً صبر طلب؛ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور پیدا کرتی ہے، سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت؛ اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے راہ رو کا رخ متعین کرتی ہے:

ملال عالمیاں دم بدم دگرگوں است
منم کہ مدت عمرم بیک ملال گزشت

بہر حال جامعہ نے اب تک کی اپنی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی

میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں، کہ شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو، اور رک رک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو اپنے ہاتھ سے نہ دیں گے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفہ کو کما حقہ ادا کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہم پر آغاز کار ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی آزادی نہیں بلکہ عمل کی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے، اور پھر کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا، اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اسلوب کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے، ان کی محبت اور شفقت، ان کی فراخ دلی اور انسانی ہمدردی، ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکر گزاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمیعۃ خلافت اٹھاتی تھی لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لئے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانے میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا، اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصہ قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو، حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ

کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے کا فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلہ کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارہ کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امنار کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا، سیاسی ردعمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں، ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو، جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر بیں نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے، کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا، چنانچہ ہمارے امنار کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیئے، روپیہ فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصہ کو زندہ رکھنے کا خیال قابل تعریف تو ہے مگر قابل عمل نہیں، اس خیال کو چھوڑ دو، کوئی اور مفید کام کرو۔ اس فیصلہ اور اس مشورہ میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط کتنی بھی ہو یقین اور جرأت کی کمی ضرور تھی۔ لیکن یہ چیزیں الحمدللہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا، ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کیا کرتے تھے۔ انھیں بتایا تھا کہ غالباً امنار کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کر دو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصے کو بچائیں؟ روپیہ نہیں ہے، قرض ہے، جلد روپیہ ملنے کی کوئی توقع بھی بظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں، بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بیجا ہوگا، کہیے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا ــــــ سب کا، بلا استثنا سب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہوگا، بلا معاوضہ کام کریں گے، ایک دوسرے کو سہلا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لئے ضرور تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا، لہذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان

خوب خوب ہوا، مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہ دیا جاسکا، لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی تبدیلی کرلی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہوگئے، سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمہ دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے، قائم کی گئی، جس میں چند بنیادی امناء کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے، ۱۱ ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ بیس سال تک، یا تاحیات، اگر زندگی بیس سال سے پہلے ختم ہو جائے جامعہ کی خدمت کریں گے، اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ طلب نہ کریں گے۔ حالات نے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب اس انجمن میں ۲۴ اراکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی اراکین ہی کی سی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ بہت مشکل تھا اس انجمن کا ابتدائی زمانہ مگر ہمارے محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا اور ان کے اثر اور سیٹھ جمال محمد کی فیاضی سے وہ سخت وقت بھی گذر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابل توجہ واقعہ ہے۔ اس لئے اس زر پرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایسا کام بنانا چاہا ہے جس کا اصلی انعام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرز عمل کی رہین منت ہیں۔ ہمارے مستقبل کے لئے اس نئے طرز خدمت کا رواج ایک فال نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لئے ایک نئی راہ نکلی ہے تعلیمی آزادی کا وہ خیال، جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہو گیا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو، بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو۔ غیر سرکاری

مدارس کی انتظامی جماعتوں اور اس کے ملازموں، یعنی واقعی کام کرنے والوں کی روز کی کشاکش، وکیلوں اور تاجروں اور عہدہ داروں کے انمل بے جوڑ، منصوبوں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زر خرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنس بازاری کی طرح بیچتے ہیں، تعلیم گاہوں میں یکجا کرکے صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں؟ تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہئے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اس کے بغیر بے چین رہیں، جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اس کام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام کرتے ہوں اور آزاد ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں۔ میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہمارا تعلیم کا کام کرائے کے کام کی بجگہ عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

آزادی اور خود مختاری کی یہ تدریجی نشو ونما بے حقیقت ہوتی اگر اپنے مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقہ اختیار نہ کرتی۔ چنانچہ جامعہ نے یہ کیا۔ ہماری جدید تعلیم گاہیں معمولاً سرکاری گرانٹ اور امرا کی امداد سے چلتی ہیں، اور اس طرح کہ ان کا وجود انھیں پر منحصر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی تعلیمی جماعت اپنے کام کے شرف کا احساس رکھ کر آزادی کی خواہش بھی رکھتی ہو تو وہ آزادی خالی دکھاوے کی آزادی ہو سکتی ہے۔ جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا۔ سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقہ کی مدد کمیاب تھی، اہل ثروت سرکاری بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے بھی ابھی اپنی ساکھ پیمانہ کی تھی کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرز کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے؟ ہم نے چند خواص کی بجگہ جمہور ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا اور ۳۲ء میں ہمدردان

جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں، جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوسرے دوستوں کو بھی اس حلقے میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبان ثروت سے نہیں بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رک جائے گا، بلکہ ہماری مدد صرف اس وقت بند ہو گی جب ہم اتنے برے ہوں کہ جمہور امت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائیں۔ اس وقت بیشک یہ مدد بند ہو بھی جانی چاہیے اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قائم نہ رکھ سکے۔

۳۲ء میں اس حلقے سے ۵ ہزار روپے جمع ہوئے تھے، ۳۷ء میں اس نے ۲۴ ہزار فراہم کیے، ۴۲ء میں ۳۲ ہزار، ۴۴ء۔ ۴۵ء میں ۴۱ ہزار اور ۴۵ء۔ ۴۶ء میں جوبلی کے خاص چندے کے علاوہ جو اسی حلقے کی معرفت جمع کیا گیا ہے، اور جس میں اس نے اب تک دو لاکھ اڑتیس ہزار روپیہ فراہم کیا ہے، اپنے معمول کے طور پر اڑتالیس ہزار روپے جمع کیے۔ اس عمومی امداد سے ہمیں پتہ چلتا رہتا ہے کہ ہماری قوم ہمارے کام کے متعلق کیا سمجھتی ہے؟ پچھلے تیرہ سال کا اندازہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حلقے نے ۵ ہزار سے بڑھا کر ہماری گرانٹ ۴۸ ہزار روپے کر دی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے ہیجان کا زمانہ رہا ہے؟ اس میں لوگ ہم سے ناخوش بھی ہوئے ہیں، ہم پر نکتہ چینی بھی ہوئی ہے، ہم نے صحیح تنقید سے سبق لیا ہے، غلط کو صبر سے سنا اور سہا ہے اور قوم نے ہمیں اس سال میں اڑتالیس ہزار چھوٹے چھوٹے چندوں کی شکل میں عطا فرمائے ہیں۔

پھر قوم کے عوام کے ساتھ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اہل ثروت کا اعتماد حاصل ہوا۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام نے، اعلیٰ حضرت فرماں روائے بھوپال نے، اعلیٰ حضرت نواب

صاحب رامپور نے، ریاست کشمیر نے، پھر دہلی میونسپلٹی نے ہمارے کام کے لئے مستقل امدادیں عطا فرمائیں اور وہ کام جو رک رک کر ہوتا، مگر ہوتا، ذرا آسانی سے انجام پا سکا۔

قوم کی مدد سے، اس کے متوسلین اور امرا دونوں کی مدد سے، یہ کام رفتہ رفتہ بڑھا، جامعہ کے پاس جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے، اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمایہ کے ایک پیسہ کے، کام شروع کیا تھا، آج اوسط قیمتوں کے لحاظ سے ۱۵ لاکھ سے اوپر کا اثاثہ ہے، موجودہ قیمتوں میں تقریباً ۲۰ - ۲۵ لاکھ کا، اس کے کام کو تعلیمی حلقوں میں، اس ملک میں، اور اس ملک کے باہر بھی کچھ نہ کچھ پسند کیا گیا۔ اس کی مثال نے اور اس کے کام کرنے والوں کے اثر نے قوم میں تعلیمی کام کے اصولوں کو کم سے کم فکری طور پر ضرور متاثر کیا ہے۔ اس کی مقبولیت بڑھی ہے، اس سال اس کے مدرسہ ابتدائی میں ایک ہزار سے اوپر داخلے کی درخواستوں میں سے صرف چالیس بچوں کی درخواستیں منظور کی جا سکی ہیں۔ جو ہم پر شبہ کرتے تھے، اور ہمارے تعلیمی کام کو اور کاموں کے لئے بس ایک آڑ سمجھتے تھے وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ حکومت ہند نے دو سال ہوئے ایک بڑی مستند کمیٹی سے ہمارا کام دکھوایا اور اس کمیٹی نے ہمارے تمام امتحانوں کے سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کی سفارش کی۔ چنانچہ ہمارا جامعہ جونیر کا امتحان سرکاری طور پر مسلمہ میٹرک یا اسکول فائنل کے مساوی تسلیم کر لیا گیا اور ہمارے استادوں کے صداقت نامے کو بنیادی مدرسوں کی معلمی کے لئے مستند مانا گیا۔ حکومت ہند نے اپنے ساٹھ منتخب اساتذہ کو ہمارے استادوں کے مدرسہ میں تربیت کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے، جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کر رہے ہیں اور ملک کے مختلف گوشوں میں علمی، تعلیمی، صحافتی، تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا، کوئی پچیس ہزار مجلدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کر لیا ہے، ایک اقامتی مدرسہ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے، جن میں جدید طریق ہائے تعلیم پر تجربے کئے جا رہے ہیں، اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لئے

مفید بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے، جو ایک مڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ، عام اجتماعات کے لئے ایک ہال، پڑوس کے شہریوں کے لئے ایک کلب پر مشتمل ہے، اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے۔ تعلیم بالغاں کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لئے ادارہ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام ایک تجربی مرکز قائم ہے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لئے طریق کار سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لئے ڈیڑھ سو سے اوپر رسالے شائع کئے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے، اور آج اردو کے خادموں کی صف اول میں اپنے لئے ایک اچھی جگہ پیدا کر چکا ہے۔ ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعات جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے، اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کرتا ہے۔ ان مختلف اداروں کے کچھ کام کا اندازہ آپ کو جوبلی کی نمائش کے ملاحظہ سے ہو سکے گا۔

غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں۔ لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے، ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے، اور بلا کسی بیجا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اٹھانے کا بھی یارا نہیں۔ پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب!! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے، اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور یہاں خونِ جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی،

پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون جگر کا بھی عمل نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے ؟ اگر یہ تمناستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلدبازی ہے ؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اکسے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ للعالمین کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو، وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے۔ اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیٰ حضرت، اکابر قوم، اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہو گا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی ؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے۔

جیسا کہ آپ صاحبان اعلیٰ حضرت کی زبان مبارک سے ابھی سن چکے ہیں، اس منصوبے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لئے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد کر ہی لیا ہے۔ طالب علموں اور استادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک اچھا کنڈر گارٹن بنانا ہے، ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لئے صنعتی اور تجارتی مدرسہ قائم کرنا ہے، لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک اقامتی درس گاہ قائم کرنی ہے، علمی تحقیق کے ادارے قائم کرنے ہیں جن میں

سب سے پہلے اسلامی علوم کے تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمۃ کو صحیح اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے،
اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور پر ایک شفاخانہ بنانا ہے،
کتب خانہ کے لئے عمارت بنانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام اور ہندوستان سے متعلق کتابوں
کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نو آبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک
مسجد تعمیر کرانی ہے۔ ان کاموں کے لئے میں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا،
اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی، لیکن یہ خیال غلط نکلا، اور
اب اس کام کے لئے تقریباً تیس لاکھ کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔ ہم نے جوبلی کے موقعے پر قوم سے
دس لاکھ روپیہ مانگا، دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے
کر دیا ہے، لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام
بھی ہو ہی جائے گا، لیکن جلد ہو یا دیر میں، ہم نے کام شروع کرتے وقت کب پہلے روپیہ جمع
ہو جانے کا انتظار کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے۔ یہ کام تو خدا نے چاہا تو ہوگا ہی، اگر
یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے جامعہ کی پچھلی روداد اور اس کے اگلے منصوبوں کا ایک مختصر سا، ذرا منتشر سا،
خاکہ پیش کر دیا ہے، اب اپنے سچے جذبات تشکر کا اظہار باقی ہے۔ سب سے پہلے اعلیٰ حضرت
کا، اس عزت افزائی اور ہمت افزائی پر شکریہ، جو حضور نے یہاں تشریف فرما ہو کر، اور
اس جلسہ کی صدارت فرما کر ہم کارکنان جامعہ کی کی ہے۔ حضور، یہ عزت افزائی اس لئے
بھی ہے کہ خدا نے آپ کو اپنی زمین کے ایک حصے اور اپنی مخلوق کی ایک معتدبہ آبادی کی پاسبانی
سپرد فرمائی ہے، آپ کو دولت و اقتدار عطا فرمایا ہے۔ آپ نے، کہ بادشاہوں کی محفل کے
لئے زینت ہیں، ہم فقیروں کی مجلس میں تشریف لانا قبول فرمایا۔ لیکن اعلیٰ حضرت سے زیادہ کس
پر روشن ہوگا، اس لئے کہ آپ دونوں کے محرم ہیں کہ اچھی دنیا میں مادی اقدار کو ذہنی اقتدار
کے سامنے، اور دولت کو فقر کے سامنے جھکنا چاہیے۔ مادی اقتدار اور دولت کے لئے یہ بڑی

سعادت ہے کہ ذہنی اقدار اور فقر اسے اپنی خدمت میں قبول فرمالیں۔ حضور کی تشریف آوری سے ہماری حقیقی عزت افزائی اور بہت افزائی، آپ کے دولت و اقتدار ہی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس فقر کی وجہ سے ہے جس کا اس لباس خسروی میں نباہ لے جانا ظاہری فقیروں کے فقر سے کہیں مشکل تر اور اس لئے بہت زیادہ واجب الاحترام ہے۔ ہم فقیروں کی عزت افزائی، اس درویش خسروی، اس شاہ فقر شعار، اس امانت دار دولت و اقتدار کی تشریف آوری سے ہے، جس کی سروری خدمت گری ہے، اور بادشاہت عبدیت کی ذمہ داریوں کو کماحقہ انجام دینے کا موقع۔ اعلیٰ حضرت ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

پھر قائد اعظم محمد علی جناح اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا تہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس جشن میں شرکت فرماکر ہمیں مفتخر فرمایا۔ آپ کی قوم کے چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا ہے۔ آپ سے بہتر کون جا سکتا ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف اسے بگڑنے سے بچاکر نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے بناتے رہنے کا طالب ہوتا ہے، آزادی ہو یا نمو پذیر حیات تمدنی، یا اقدار عالیہ مطلقہ، ... ایک بار حاصل کرنے اور سونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ انھیں کو ملتی ہیں اور انھیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم ان کے از سر نو حصول اور ہر دم از سر نو تخلیق کی دشواریاں انگیز نے پر تیار ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اسی تخلیقی عمل کے نمائندے بننا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام کو پسند فرمائیں گے، آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہوگی۔

پھر پنڈت جواہر لال نہرو، اور دیگر وزرائے حکومت ہند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ہماری اس تقریب میں شرکت کے لئے وقت نکالا۔
آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاکر میں تعلیمی کام کرنے والوں

کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج تک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورہ میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے۔

پھر ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہمارے جشن میں شرکت فرما کر اس کو رونق بخشی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمارا دل بڑھایا، اس بدامنی کے زمانے میں سفر کی صعوبتیں برداشت فرمائیں۔ ہم شرمندہ ہیں کہ ان کے آرام و آسائش کا پورا انتظام نہ کر سکے، لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ان فروگذاشتوں کو معاف فرما دیں گے۔

ان کارکنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً عہدہ داران ریاست رامپور کا جن کی مدد کے بغیر ہم اپنے مہمانوں کو اتنا آرام بھی نہ پہنچا سکتے، ان دوستوں نے ہمارے ساتھ اس طرح کام کیا کہ گویا یہ ان ہی کا کام تھا، اور سچ یہ ہے کہ ان کا کام اسی قدر تھا جتنا کہ ہمارا، ہم ان کی اس عنایت کو کبھی نہ بھولیں گے

آخر میں اعلیٰ حضرت، میں چند لمحوں کے لئے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کرکے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا۔ حضور والا نے اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں، کاش میں اس کا مستحق ہوتا۔ حضور، جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے، یہ قوم کے بچوں کے لئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لئے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیق رسائل کو ترستے ہیں، انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لئے زمین خریدوا دیتے ہیں، اور اپنے مطالبات کو موخر کر دیتے ہیں، یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لئے ایک فال نیک ہیں، انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے۔

آغشتہ اندہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ اند

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پروفیسر محمد مجیب

تقریر شیخ الجامعہ

(بہ تقریب جشن زریں منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء)

ذیل کی تقریر جامعہ کے جشن زریں کے موقع پر، ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو جلسۂ یوم تاسیس میں پڑھی گئی، جشن میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی۔

محترمہ مسز اندرا گاندھی!

میں بہت شکر گذار ہوں کہ آج آپ نے یہاں تشریف لاکر جامعہ کی برادری اور اس کے ہمدردوں کو مخاطب کرنا منظور فرمایا۔ شاید ہماری طرح آپ خود بھی محسوس کررہی ہوں گی کہ اس وقت، جامعہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر، آپ گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان تمام رہنماؤں کی نمائندگی کررہی ہیں جنھوں نے ملک کو آزاد کیا اور ہم تعلیم کا کام کرنے والوں کو ہمت دلائی کہ کچھ بھی ہو، اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ آپ کی تشریف آوری نے بہت سی یادوں کو تازہ کردیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اسی جگہ جہاں یہ شامیانے لگے ہیں، جامعہ کی سلور جوبلی کا جلسہ ہوا تھا، تب شامیانے نہیں تھے، رام پور سے مانگ کر ایک بڑا خیمہ آیا تھا اور اس کے بیٹھنے والوں میں کانگریس اور مسلم لیگ کے تمام چوٹی کے لوگ تھے جنھیں ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کی کشش نے ایک جگہ جمع کردیا تھا۔ سب نے اس کا اعتراف کیا کہ

جامعہ صحیح معنوں میں ایک قومی تعلیم گاہ ہے۔ اب چوبیس برس بعد ہم کہتے ہیں اور لوگ اسے مانتے ہیں کہ جامعہ ایک قومی تعلیم گاہ ہے، لیکن پہلے اس کا مطلب کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہے اور یہ ایک بڑی دلچسپ اور سبق آموز داستان ہے کہ مطلب کا یہ فرق کیسے پیدا ہوا۔ میں اسے اس لیے بھی سنانا چاہتا ہوں کہ یہ صرف جامعہ کی داستان نہیں ہے، ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک عکس بھی ہے۔

آزادی کے بعد جامعہ کی عزت اور حیثیت بہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ تھے اور گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا آزاد کے بہت قریب تھے، خود مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت ہند کے سارے انتظامی کام میرے دوستوں اور ساتھیوں کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے کہ ہر منسٹری میں ایسے لوگ اونچے عہدوں پر تھے جو میرے زمانے میں اوکسفرڈ یا کیمبرج میں پڑھتے تھے، تعلیم کے کئی میدانوں میں جامعہ کا بہت دخل تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہندستانی تعلیمی سنگھ کے قریب دس سال سے صدر تھے اور بنیادی تعلیم کے پرچار میں گاندھی جی کے ساتھ انھیں کا نام آتا تھا۔ ہمارا استادوں کا مدرسہ ۳۸ء میں قائم ہوا تھا اور اس کے ذریعے ہندستان کے کئی صوبوں میں بنیادی تعلیم کی طرح ڈالی گئی تھی۔ شفیق الرحمان قدوائی صاحب نے نمونے کے سوشل اور کمیونیٹی اور یوتھ ایجوکیشن سنٹر قائم کیے تھے اور نو آموز بالغوں کے لیے پوسٹر اور چھوٹی چھوٹی کتابوں کا قریب ڈیڑھ سو کا سٹ تیار کیا تھا۔ ایڈلٹ اور سوشل ایجوکیشن کے رہنما اور روح رواں وہی مانے جاتے تھے۔

جامعہ کا ایک نمونے کا پرائمری اسکول تھا جس میں بنک اور دوکان، کھیتی اور پولٹری فارم جیسے پروجکٹس کے ذریعے تعلیم دینے کے بہت مفید تجربے کیے گئے۔ آزادی ملنے پر ان کاموں کو فروغ دینے اور جامعہ کو ایک تعلیمی تحریک کا مرکز بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا اور شفیق الرحمان قدوائی صاحب کو پہلے یونسکو اور پھر دہلی کی حکومت نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ جامعہ مجبور ہو گئی کہ ان کے بغیر اپنی گاڑی

چلائے۔ اس کی گاڑی رکی نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس طرح چلی اور کس نے چلائی۔

جامعہ کو اپنا خرچ پورا کرنے اور اپنے کاموں کو ترقی دینے کے لیے سالانہ امداد کی ضرورت تھی۔ وزارت تعلیم میں اس کے جو ہمدرد تھے اور اس میں شک نہیں کہ وہ واقعی ہمدرد تھے، انھیں کوئی ایسا بنا بنایا، یعنی انگریزی حکومت کا بنایا ہوا قاعدہ قانون نہیں ملا جس کے مطابق جامعہ کو گرانٹ دی جا سکے۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ان سرکاری ہمدردوں کی پست ہمتی پر ایسے خفا اور مایوس تھے کہ ایک مرتبہ جب انھیں ایجوکیشن سکریٹری نے کسی سلسلے میں فون کیا تو انھوں نے فون اٹھا کر مجھے دیدیا اور کہا کہ آپ ہی ان سے بات کیجئے، میں نہیں کروں گا، اسی زمانے میں انھوں نے کہا کہ میں گرانٹ کی کسی درخواست پر دستخط نہیں کروں گا، آپ کو جو کچھ کرنا ہو خود کیجئے۔ میں نے ایک درخواست تیار کی تھی، وہ میں نے وزیر تعلیم کو بھیجدی، ان کے دفتر سے یہ نیچے اترتے اترتے سکشن آفیسر کے پاس پہنچی، سکشن آفیسر ایک سندی شرنارتھی تھے، انھوں نے اس پر ایک نوٹ لکھا جو میری درخواست سے کہیں بہتر تھا اور پھر یہ فائل اوپر چڑھتے چڑھتے وزیر تعلیم کے پاس پہنچی ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں تو انھوں نے اسے سکریٹری کے پاس بھیجدیا، سکریٹری نے مجھے بلایا اور ایسے سوال کئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے درخواست کو پڑھا نہیں ہے، پھر ڈپٹی سکریٹری ایل آر سیٹھی کو بلایا، انھوں نے سمجھانا چاہا کہ جامعہ کو قاعدے کے اندر گرانٹ دی جا سکتی ہے تو فائل انھیں کے سپرد کر دیا اس انداز سے کہ اگر وہ سکریٹری کے پاس دوبارہ نہ آئے تو بہتر ہے۔ مجھے درخواست کا کوئی جواب نہ ملا، پھر ہمارے مالاباری استاد ای جے کیلاٹ، بغیر کسی سے مشورہ کئے ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر کے پاس پہنچے، جن سے ان کی اچھی ملاقات تھی، اپنا پھٹا کوٹ اور اپنی پھٹی قمیص دکھائی اور کہا کہ لعنت ہو تمھارے اوپر جو یہاں اس عہدے پر بیٹھے ہو اور میرا یہ حال ہو گیا ہے۔ ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر بھلے آدمی تھے، انھوں نے جامعہ کا فائل، جس نے سفر کرتے کرتے ان کے یہاں دم لیا تھا، منگوایا اور سفارش کر دی کہ جامعہ کو تنخواہیں بڑھانے کے لئے ہر سال ۲۸ ہزار روپئے دیدئے جایا کریں۔ اس کے

بعد ہم نے وہی کیا جواب تک ضد میں نہیں کیا تھا، پرائم منسٹر کے پاس گئے اور مدد کا مطالبہ کیا اس پر ایک لاکھ سالانہ کی منظوری ملی، یہ رقم کافی نہ تھی، دو سال بعد پھر مطالبہ کیا، اس پر طے ہوا کہ جامعہ کی آمدنی وضع کرنے کے بعد جو خرچ نکلتا ہو وہ گرانٹ کے طور پر دیا جائے۔ مجھے یاد ہے اسی زمانے میں اسکول کے بچوں نے اصرار کیا کہ ہم پنڈت جی کو جامعہ بلائیں گے، ان سے ملاقات کا وقت مقرر کیا گیا اور میں بچوں کو لیکر پارلیمنٹ ہاؤس میں پرائم منسٹر کے دفتر میں پہنچا۔ جب بچے ملنے کے لیے بلائے گئے تو میں نے ان کو اندر بھیجدیا، خود سکریٹری کے کمرے میں بیٹھا رہا، اس خیال سے کہ کہیں پنڈت جی یہ نہ سمجھیں کہ میں بچوں کی ملاقات کو بہانہ بنا کر خود ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے جب وہ بچوں کو رخصت کرنے لگے تو ان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے اور مجھے دیکھ لیا۔ مسکرائے اور کہا کہ "اچھا یہاں چھپ کر بیٹھے ہو"۔ آپ سمجھئے کہ یہی قریب ہوتے ہوئے چھپے رہنا ہمارا طریقہ تھا، ٹھیک ہو یا غلط۔

ہمارے تعلیمی کاموں میں مدد ملنے کی صورت بھی عجیب تھی۔ میں شفیق الرحمان قدوائی صاحب کے ساتھ تھا جب وہ مولانا آزاد سے ملنے گئے اور انھیں اپنی کتابوں کا سٹ، جس کے لیے ایک خوبصورت اور سستا لکڑی کا کیس بھی بنایا گیا تھا، دکھایا۔ مولانا نے اسے پسند کیا، مگر پسند کر کے رہ گئے۔ کئی مہینے بعد منسٹری کے ایک انڈر سکریٹری سردار سوہن سنگھ نے شفیق صاحب سے مشورہ کر کے ایسی ہی کتابوں کو تیار کر کے ملک میں تقسیم کرنے کی اسکیم بنائی، اسے ڈپٹی سکریٹری اور سکریٹری سے منظور کرایا اور پھر اسے مولانا آزاد کے سامنے پیش کیا۔ معلوم نہیں دفتر کے قاعدے اس کی اجازت دیتے ہیں کہ نہیں لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ مولانا کے پاس سے نہیں ہٹے جب تک کہ انھیں اسکیم پر عمل کرنے کا حکم نہیں مل گیا۔ جامعہ کو یہ کتابیں لکھنے اور چھپوانے کے لیے گرانٹ ملی اور ہم نے قریب تین سو کتابیں چھاپیں، مگر یہ صرف ٹھیکے کا کام تھا، اس کا نہ ماضی سے تعلق تھا نہ مستقبل سے، جب یہ ختم ہو گیا تو حکومت سے ہمارا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اسی طرح کا کام گیان سرور کی تیاری کا تھا، جو بہت مقبول ہوئی۔

۴۸ء، ۴۹ء میں ہم نے شمالی ہندوستان کی ریاستوں کا جائزہ لیا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کنڑیبیسی کے پروگراموں کا کیا اثر ہوا ہے، جب جائزے سے ثابت ہوا کہ اثر بہت کم ہوا ہے تو ہم نے ایڈلٹ اسکولز کی اسکیم تیار کی، جو بڑی مشکل سے دو سال کے لیے منظور ہوئی۔ ہمیں تھوڑے ہی دنوں میں اندازہ ہوگیا کہ یہ اسکیم بہت مفید ثابت ہوگی، مگر اسی دوران میں منسٹری نے اپنی رائے بدل دی، گرانٹ کی قسطیں آنا بند ہوگئیں اور ہم ایسی مصیبت میں پڑگئے کہ اس کے بعد والنٹری ایجنسی کے طور پر کام کرنے سے توبہ کرلی۔

شاید سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ کہانی ہے کہ ہمیں یونیورسٹیوں کی برادری میں کیسے شامل کیا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ میں ڈاکٹر ضیاء الدین کے مخالفوں نے یہ سوال اٹھایا کہ جامعہ ملیہ کی ڈگریوں کو کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس وقت کی حکومت ہند سے پوچھا کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر سر جون سارجنٹ نے، جو اس زمانے میں ایجوکیشن کمشنر تھے، ہم سے پوچھا کہ ہم کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر اس مسئلے میں مناسب سفارش کرنے کے لئے ایک سرکاری کمیٹی ہمارے سلیبس اور نظام تعلیم کا معائنہ کرے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا تو ایک سرکاری کمیٹی معائنے کے لیے آئی اور اس نے سفارش کی کہ ہماری تمام ڈگریوں کو تسلیم کرلیا جائے۔ کچھ کانا پھوسی کے بعد حکومت ہند نے طے کیا کہ ہمارے میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ کو یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے کافی سمجھا جائے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اسکول کے اچھے طالب علم سب مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگے اور ہمارا اپنا کالج خالی ہوگیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد ایجوکیشن منسٹری میں جو ہمارے ہمدرد تھے ان میں سے بعض مشورہ دینے لگے کہ جامعہ کو کسی طریقے سے مسلم یونیورسٹی سے ملایا جائے۔ ہم نے ان کی رائے نہیں مانی۔ ۱۹۵۶ء میں جب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم ہوا تو ہم نے رکگنیشن کے لیے درخواست دی، جس کے دو برس کے بعد دو سطروں کا جواب آیا کہ ہماری درخواست منظور نہیں کی جاسکتی۔ جب ڈاکٹر کوٹھاری صاحب یو جی سی کے چیرمین مقرر ہوئے تو ان کی تدبیر نے ہماری تقدیر

کو بدل دیا۔ جون ۶۲ء سے جامعہ ملیہ یونیورسٹی نہیں مگر یونیورسٹی جیسی اعلیٰ تعلیم کی سنستھا مان لی گئی ہے اور اب ہمارے لئے ترقی کے وہ راستے کھل گئے ہیں جو سرکاری امداد کی بدولت کھل سکتے ہیں۔

اب جامعہ آباد ہے، طالب علم ہیں، استاذ ہیں، عمارتیں ہیں، لیکن کیا ہمارا اصل مقصد یونیورسٹیوں جیسی ایک اور یونیورسٹی بنانا تھا؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جامعہ کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ مذہب، تہذیب، اخلاق، سیاست کو تعلیم کے ذریعے ایک جسم، ایک جان بنایا جاسکتا ہے اور خود ایک نمونہ بن کر ملک میں اس کا چرچا کرنا تھا۔ خود جامعہ کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی شخصیت دینی، تہذیبی اور سیاسی قدروں کی صحیح آمیزش کا نمونہ تھی۔ جامعہ نے اپنے بس بھر جو کیا جاسکتا تھا کیا، انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حکومت کی مدد کے بغیر تعلیم کا کام نہیں کیا جاسکتا، ہم نے حکومت کی مدد کے بغیر اپنا کام چلایا، پھر جب یہ کہا جانے لگا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں دو قومیں ہیں جن کے مذہب، تہذیب اور اخلاق میں بنیادی تضاد ہے، تب ہم اس پر اڑے رہے کہ سچے مذہب، سچی تہذیب، سچے اخلاق سے اتحاد پیدا ہوتا ہے، اختلاف پیدا نہیں ہوتا، لیکن آزادی کے بعد معلوم ہوتا ہے ہمارے ہمدردوں اور دوستوں کی رائے کچھ یہ ہوگئی کہ جامعہ والے خود تو اچھے لوگ ہیں، مگر جو کام وہ کر رہے ہیں اس کی اب ضرورت نہیں ہے اور جامعہ کی حیثیت قومی تحریک کی ایک یادگار کی سی ہوگئی۔ ہمارے وہ رہنما جو ہر معاملے میں جرأت اور فراست سے کام لیتے تھے نہ جانے کیوں جامعہ کے معاملے میں اعتراضات سے ڈرتے رہے، انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہماری تاریخ اور ہماری خاص صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ہم سے ایسے کام لئے جاسکتے ہیں جو تعلیم اور سماج کے رشتے کو مضبوط کرسکتے ہیں اور جن کے لئے عام کالج اور یونیورسٹیاں ہماری طرح کا تجربہ نہیں رکھتی ہیں، بلکہ ہمیں یہ دکھانے پر مجبور کیا کہ دراصل ہم عام سرکاری تعلیم گاہوں سے مختلف نہیں ہیں۔

جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں، اب ہمیں ہر طرح کا اطمینان ہے، لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

کہتے رہتے تھے کہ یہی اطمینان سب سے بڑا خطرہ ہے، کہ یہ فروعات کی اہمیت کو بڑھاکر خیالی اور عمل کے میدان کو تنگ اور ضمیر کو غافل کر دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی رائے بھی یہی ہوگی اور آپ ہی ہمیں تعلیم کے اس راستے کو چھوڑ کر جس پر چلنے والوں نے اتنی گرد اڑائی ہے کہ منزل مقصود نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے، نئی راہیں اختیار کرنے کا موقع دے سکتی ہیں۔ جامعہ کی طرف سے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارا مذہب اب بھی اس سچے استاد کا مذہب ہے جو ظاہری باتوں سے گذر کر ہر انسان کی انسانیت کو اجاگر کرتا ہے، اخلاقی شعور کو بیدار کرتا ہے، بھائی چارہ کے آداب کو خدا کے احکامات سمجھ کر برتتا ہے، ہماری تہذیب اب بھی وہ تہذیب ہے جو ہر انسان میں خیال اور عمل کے حسن کو تلاش کرتی ہے، جس میں کسی انسان کی انسانیت کی قدر نہ کرسکنا ایک ایسا عیب، کسی کا دل دکھانا ایسا ظلم مانا جاتا ہے کہ اس سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہیئے۔ ہمارے یہاں اب بھی ایسے سرپھرے لوگ موجود ہیں جو کام کی اہمیت کو دیکھتے ہیں، معاوضے کو نہیں دیکھتے، جن کا شوق ہر طرح کی آزمائش کا منتظر رہتا ہے۔ آپ نے ذاکر حسین سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز قائم کر کے ہمارے لیے تہذیبی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی ہے۔ ہمیں اس کا بھی موقع دیجئے کہ شمالی ہندوستان کی اس تہذیب میں جس کا علم بردار آپ کا اپنا خاندان بھی رہا ہے اور جس کی اب تک دلوں پر حکومت ہے، چاہے زبانیں اس سے بغاوت کر چکی ہوں، نشاعرے کی سی کشش پیدا کرسکیں۔ ہمارے پرائمری اور سکنڈری اسکول ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے لاڈلے تھے۔ ہم نے ان اداروں میں ایک بہت اچھی نرسری کا اضافہ کیا ہے اور ہم ان کی یہ خواہش کہ انھیں ایک تعلیمی لیبوریٹری بنایا جائے، اب بھی پوری کرسکتے ہیں اگر ہمیں ذرا سا سہارا مل جائے۔ ہم کو ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں ناموافق حالات سے لڑتے لڑتے نقصان نہیں ہوا ہے۔ اب ہم ستانا نہیں چاہتے، پچاس سال کی محنت کا معاوضہ نہیں مانگتے، ہم آگے بڑھنے کا شوق اور اس شوق کو آزمانے کی ہمت رکھتے ہیں، بس آپ یہ کہہ دیجئے کہ ہاں آگے بڑھو، میں بھی ساتھ ہوں۔

رانا جنگ بہادر سنگھ

جامعہ ۔۔۔ ابتدا میں انتہا

اسی صدی کی بات ہے ۔ آزادی کی تمنا کا اس ملک میں ایسا طوفان آیا تھا کہ اس نے دلوں اور دماغوں کو ان کی جڑوں تک جھک جھور ڈالا تھا ۔ انقلابی روحوں نے عوام کو جگا کر ایسے جذبات اور خیالات سے مسلح کر دیا جس سے وہ ودیشی ہتھکڑی بیڑی کاٹ کر اپنی قسمت کو بدل ڈالنے میں کامیاب ہو سکیں ۔ میرا یہ مختصر مضمون اور کچھ نہیں ہے ، انھیں دنوں کی ان گنت غیر معمولی تواریخی کہانیوں میں سے ایک چھوٹی سی کہانی ہے ، جب خواب سچا ہو کر بھی ، بنیادی نقطۂ خیال سے چھوٹا ہو جاتا ہے ، تب پریشان من اپنے کو بہلانے کے لئے ، ایسی ہی پرانی پیاری کہانیوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے ۔

اس وقت کی ایک بات کا ذکر کرنے جا رہا ہوں ، جب کالے قانون رولٹ ایکٹ کی چوٹ کھا کر قوم نے کروٹ بدلی تھی ۔ تب میں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا ۔ عمر کچی تھی ، علم کی ابھی انگلی ہی پکڑی تھی اور تجربہ نہیں کے برابر تھا ، امنگ ایسی آئی کہ امتحان ابھی چل ہی رہا تھا کہ میں قومی جدوجہد میں شامل ہو گیا ، میٹرک پاس تو ہو گیا لیکن اسکول سے رسٹی کیٹ کر دیا گیا ، پھر کسی طرح ذہنی داؤ پیچ کے بل پر لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخلہ حاصل کر لیا ۔ کتنے دن تک کورس کی کتابوں کے نیچے اپنا سیاسی رنگ چھپائے رکھ سکتا تھا ؟ ایک دن انگریز پرنسپل کیمرن صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا کہ " اگر آپ شرافت سے چلے جائیں گے تو میں آپ کو اچھے چال چلن کی سند دیدوں گا ۔ ورنہ .... " شرافت ہی میں میں نے خیریت سمجھی اور لکھنؤ

سے الہ آباد کے لئے ٹکٹ کٹا لیا۔ کیمرن صاحب کی دی ہوئی سند پیش کر کے کائستھ پاٹھ شالا کالج میں داخلہ حاصل کر لیا۔ میں نے اس بار احتیاط برتی، پھر دھکا کھانے سے بچنے کے لئے، پہلے ہی سے ڈاکٹر تارا چند کو، جو پاٹھ شالا کے پرنسپل تھے اپنا کچا چٹھا بتا دیا، یہ ۱۹۱۹ء کی بات ہے۔

اس کے بعد ہی تو گاندھی جی کی تحریک نے، جس کو شاعری کی زبان کے استاد اکبر نے آندھی بتایا تھا، اتنا زور پکڑا کہ بڑھاپا، جوانی، بچپن، سبھی اس کی پکڑ میں آ کر اس کی رفتار سے اس کے ساتھ چل پڑے۔ میں دو مرتبہ اپنے جنون کی منھ زوری کا خاصا مزا لے چکا تھا، اس لئے میں نے لگام کس رکھی تھی، لیکن ۱۹۲۲ء میں بڑے پیمانے پر والنٹیروں اور لیڈروں کی گرفتاریاں اور پولیس کی زیادتیوں کے بعد، مجھ پر دیوانگی کا پھر ایسا عالم طاری ہوا کہ میں کتابوں کو ایک کنارے رکھ کر آزادی کی لڑائی کے میدان میں بے تحاشہ کو د پڑا۔

ان دنوں طالب علموں کو ——— وہی تو قومی شباب کی رنگین قوت تھے ——— تحریک میں لانے کے لئے یہ نعرہ بلند کیا گیا تھا کہ "سرکاری یونیورسٹیاں اور کالج غلام خانے ہیں اس لئے ان کو چھوڑ دو" ـــ میں نے خود تو اس نعرہ کی معقولیت کو قبول ہی کیا، الہ آباد یونیورسٹی میں گھوم گھوم کر اس کو سارے احاطہ میں مقبول بنانے کی انتھک کوشش کی اور بہت سے ساتھیوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے مائل بھی کر لیا۔ پھر بدیسیوں کے چالو اور لاگو کئے ہوئے قانون پر قانون توڑے، ہر طرف اور ہر طریقے سے مار کرنے والی دفعہ ۱۴۴ ـــ جو ابھی تک نہ دفن ہوئی ہے اور نہ دفع ——— کی گھڑکیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے والنٹیر بھرتی کئے، جلوس نکالے، تقریریں کیں اور مانچسٹر کے بنے کپڑے کی دوکانوں پر دھرنے دئے، پھر جب چوری چورا کے واقعات کے بعد، گاندھی جی نے ڈبل مارچ کے دوران ایک دم ہالٹ بولدیا، تب گہرے صدمے کے باوجود میں الہ آباد یونیورسٹی عرف غلام خانہ کی گود میں واپس نہیں گیا۔

پھر پہونچا کہاں؟ جامعہ۔ اسی کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لئے اتنی بڑی تمہید

رچ ڈالی ہے۔ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ یہ تمہید اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی میری کوئی باریک سی چتر ترکیب ہے، اس کی غرض محض یہ ہے کہ اس وقت کی انقلابی فضا، اصول اور نصب العین کے عجیب وغریب اثر کا آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے۔ وہ ایک طرح کا جادو ہی تھا جس نے میرے ایسے ہزاروں خاکساروں کی زندگی کا رُخ حب الوطنی اور انسانیت پرستی کی طرف پھیر کر ان کی شخصیت کو طوفان بنا دیا تھا۔

میں جامعہ کاشی ودیاپیٹھ کا چکر لگاتا ہوا پہونچا۔ مجھے ودیاپیٹھ میں کئی ہم عمر ساتھیوں کا رنگ روپ دقیانوسی لگا ـــــ سب کا نہیں ـــــ اس لئے میرا وہاں جی نہیں لگا۔ یہ نہیں کہ مجھے جسمانی سادگی اور روحانی ورزش سے چڑھ ہے۔ مجھے دونوں ہی کافی پسند ہیں۔ لیکن ہونی چاہئیں وہ بیسویں صدی کے مارکہ کی۔ جامعہ (یونیورسٹی) کا جامہ سرکاری یونیورسٹیوں (غلام خانوں) کی پوشاک سے مختلف ہوتا ہوا بھی گئے گذرے زمانے کا نہیں، نئے نکھرتے زمانے کا تھا۔ اس میں اس کی قومی تہذیب کا حسن اور انسانی تمدن کا جلال ایسا دل کش لگتا تھا کہ جس نے بھی تعصب کے پردے کو ہٹا کر دیکھا نہال ہو گیا، بہت دن ہوئے میں نے جامعہ کے ایک رسالے میں انقلابی طوفان کی دین اس مرکز تعلیم کی بے نظیر صنعتوں کا اور اس کی بے جوڑ ہستی کے کرشموں کا، جو میری طالب علمی کے زمانے کے تجربوں کا بہترین حصہ ہیں، سرسری طور سے ذکر کیا تھا، ٹھیک یاد نہیں کیا لکھا تھا۔ حتی الامکان ان باتوں کو دہرا کر بور کرنے کی غلطی سے بچنے کے لئے، نئی پٹری پکڑوں گا اور جامعہ کی وضع قطع اور ادا کے کچھ ابھرے ہوئے من موہک پہلوؤں کی چرچا چلا کر "فقط" لکھ دوں گا۔

حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین ایسے عظیم الشان قومی رہنماؤں نے، جن کی پاک ہستیوں پر فرقہ وارانہ بغض وکینہ تک کوئی تہمت لگانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اور جن کا نظریہ اتنا وسیع تھا جتنا کہ یہ عالم اور جن کی ذہنیت اتنی بلند تھی جتنی کہ انسانیت جامعہ کو بنا کر اس میں جان ڈالی اور اس کو تاریک گوشوں میں روشنی پھیلانے کو چھوڑ دیا۔

حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے گذر جانے کے بعد، مشکلات کے پہاڑ کے نیچے دب کر جامعہ دم توڑنے لگا، اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین کی مسیحائی نے اس کی جان ہی نہیں بچائی بلکہ اس کو صحیح روشنی پھیلانے والی اور صحیح حرارت پیدا کرنے والی تعلیمی مشعل کی شکل دی۔ محبت ڈاکٹر ذاکر حسین کا مذہب تھا، اور خلوص ان کا لباس۔ ایک فرشتہ اپنے بھولے پن میں آسمان سے زمین پر اتر آیا تھا، اور ہم گمراہوں اور گناہگاروں کے بیچ آ بسا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بھولے پن نے ایسی سادگی اور پاکیزگی کا روپ رنگ اختیار کیا جس کی مثال ہی ہماری غلطیوں کا سدھار اور ہمارے گناہوں کا کفارہ کرنے کے لئے کافی تھی، ان کی سادگی اور پاکیزگی ان کی شان وشوکت تھی، وہ تب بھی بے داغ ہی رہی جب وہ ہندوستان کے پریسیڈنٹ بن گئے۔ جب کبھی میں پریسیڈنٹ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملا، نہ مجھے ان کی پریسیڈنٹی کا تاج نظر آیا اور نہ ڈاکٹری کا گاؤن۔ انھیں سدا ہی پرانے سادے ذاکری لباس میں اپنے دلارے عقیدوں اور اصولوں کو پالتے پوستے دیکھا۔ وہ جن کے لئے "ذاکر صاحب" تھے ان کے لئے ہمیشہ "ذاکر صاحب" ہی بنے رہے۔ ساتھیوں کا پیار اور ادب اتنے برسوں سے انھیں اس طرح پکارتا آرہا تھا کہ یہ دو لفظ ان کے من کو مگن کرنے کے لئے کافی تھے۔ ان کی طرف سے ان میں کوئی اضافہ ان کے لئے سخت ناگوار تھا۔ جن چند خوش نصیب ہستیوں کا ان کے ساتھ دانت کاٹی روٹی کا رشتہ تھا ان کے لئے تو وہ دو لفظ بھی نہیں محض تین حرف تھے۔ ذاکر۔ یہی "ذاکر" جامعہ کی جان تھے، ظاہر ہے کہ "ذاکری" جامعہ جو تعلیم دیتا ہے اس میں اصولاً کسی بھی بنیادی نقص کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

۲۳۔ ۱۹۲۲ء میں جب میں جامعہ کی بی اے کلاس میں پڑھ رہا تھا تب ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی پہونچے ہوئے تھے۔ مولانا محمد علی شیخ الجامعہ تھے اور خواجہ عبدالمجید پرنسپل۔ جامعہ کا جنم انقلابی طوفان سے ہوا تھا، قدرتاً اس کی صورت طوفانی تھی اور رغبت انقلابی۔ جامعہ میں اس وقت تقریباً آدھے درجن پروفیسر ایسے تھے جن کے دل و دماغ نے لندن،

آکسفورڈ اور کیمبرج کی آب و ہوا میں ـــــ جن میں نہ تو خیالات کی گھٹن تھی اور نہ مذہبی جہالت کا زہر ـــــ پرورش پائی تھی۔ وطن کی محبت، آزادی کی لگن اور ملک کی بیدار و بے قرار جوانی کو صحیح راستہ دکھانے کی دھن میں ان کو جامعہ میں لا جمع کیا تھا۔ جامعہ کے اور پروفیسر بھی ہم پرواز ہی تھے، ورنہ کہیں اور اڑتے پھرتے۔ پروفیسروں میں مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی، اینگلو انڈین سبھی تھے۔ مسلمان اور ہندو پروفیسروں کے نام گناؤں گا تو کئی چھوٹ جائیں گے۔ ان کی تعداد خاصی تھی نا۔ کچھ اوروں کے نام جو یاد آرہے ہیں لکھے دیتا ہوں۔ پروفیسر کیلاٹ، پروفیسر ماسٹر، پروفیسر البن۔ پروفیسر کیلاٹ عیسائی تھے جو ان تھرالوجی پڑھاتے تھے۔ ان تھراپولوجی دیومالائی حماقتوں کو ظاہر کرنے والا مضمون ہے۔ یہ اور ایسے ہی مضمون، جو عقل کی راہ روشن کرتے ہیں پڑھاتے ہوئے کیلاٹ صاحب نے اپنی ساری زندگی جامعہ میں بتادی۔ ان کی عیسائیت کی ایک ایک سانس کا ـــ آخری سانس تک پیغام تھا پریم۔ پروفیسر ماسٹر پارسی تھے جو پروفیسر البن کی جن کا اینگلو انڈین فرقہ سے تعلق تھا، جرنلزم کی کلاس میں مدد کیا کرتے تھے۔ البن صاحب صرف قلم کی کاریگری ہی نہیں سکھایا کرتے تھے بلکہ اس کا صحیح استعمال بھی بتایا کرتے تھے، میرا خیال ہے کہ اخبار نویسی کی باقاعدہ تعلیم سب سے پہلے جامعہ میں دی گئی۔ اور وہ دی بھی گئی اس طرح جس طرح دی جانی چاہئے تھی۔ میں نے جامعہ میں جرنلزم کی تعلیم پاکر پہلے مولانا محمد علی کے "کامریڈ" اخبار میں کام کیا ـــ مولانا صاحب مجھے اپنے خلوص و محبت کا قیدی بناکر جامعہ سے اپنے ساتھ لے گئے ـــ پھر اور اخباروں میں۔ جامعہ نے مجھے، میرے اخبار نویسی کی کلاس کے اور ساتھیوں کی طرح، یہ فن آزادی کے شیدائیوں کو تقویت پہونچانے کے لئے، اور آزادی کے حاصل ہونے پر انسانیت کا پیغام ہر دل عزیز کرنے کے لئے سکھایا تھا۔ ہمیں پیشہ ور نہیں مشنری بنایا گیا تھا۔ میرا یہ دعویٰ کہ میں نے، لاہور کے "ٹریبون" کے اڈیٹر اور پھر دہلی کے ٹائمز آف انڈیا کے اڈیٹر کی حیثیت سے، اخباری دنیا میں ترقی کی چوٹی پر پہونچکر بھی جامعہ کے سکھائے سبق کو نظر انداز نہیں کیا، جامعہ کی تعلیمی عظمت پر پھول چڑھانے

کے برابر ہے ۔ وہ قلم کیا جو نیلامی پر چڑھے ۔ قلم تو وہ ہے جس کی قیمت نہ لگ سکے ۔

جامعہ میں، پروفیسروں کے گلدستہ کی طرح ، طالب علموں کا گلدستہ بھی ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے رنگ برنگ کے پھولوں کا بنا ہوا تھا ۔ ان میں بھی مختلف مذہبوں اور فرقوں کے لوگ تھے ، لیکن نہ خوشبوؤں میں جنگ تھی اور نہ رنگوں میں رسّہ کشی ۔ پڑھائی کے مقصد اور طور طریقہ سے عقل کو تخت طاؤس پر بٹھا کر ، بھائی چارے کا راج قائم کیا تھا ، اکثر مختلف مذاہب والے طالب علم ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتے تھے ۔ اور ہمراہ تو ہمیشہ ہی ۔ نوجوان سرکاری نوکری کرنے کیلئے اور ادہم مچانے کے لئے تیار نہیں کئے جا رہے تھے بلکہ ملک کی خدمت کرنے کے لئے اور انسانیت کا پرچار ۔ نوجوان کو ، ایک نئے سانچے میں ڈھال کر ، ایک نیا انسان بنانے کی سرگرم کوشش کی جا رہی تھی ۔ جمہوری خلوص اس حد تک بڑھا تھا کہ ہم اپنے کچن میں کام کرنے والے ملازموں کے گاؤں میں جا کر ان کے مہمان بنا کرتے تھے اور اور ان کے ساتھ پک نک کا مزہ لیا کرتے تھے ۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایسی ہی ایک پک نک میں گنے کے رس میں بنی ہوئی کھیر کھانے کا لطف حاصل ہوا تھا جس کا ذائقہ مجھے اب تک یاد ہے ۔

شریف سائنس اور سچے مذہب میں کسی طرح کا بھید نہیں ہے ، اور بنیادی مذہبی اصولوں میں چاہے وہ کتنے ہی مختلف رنگوں کے ہوں دور کی بھی دشمنی نہیں ہو سکتی ۔ اس امر کی بنا پر جامعہ میں سائنٹفک تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جاتی تھی ۔ میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ اور سبھی ہندو طالب علموں کے ساتھ مجھے بھی لوک مانیہ تلک کی لکھی ہوئی گیتا رہسیہ نام کی بڑی موٹی کتاب شروع سے آخر تک پروفیسر سنگل نے پڑھائی تھی ، مجھے اس مضمون میں امتحان دے کر کامیاب ہونا پڑا تھا ، ورنہ بی اے کی ڈگری سے محروم رہتا ۔ ایک طرف سر پی سی رائے اور ان کے شاگرد الہ آباد یونیورسٹی کے کیمسٹری کے پروفیسر امتحان لینے آتے تھے تو دوسری طرف پنڈت اور مولوی ۔ میرے جامعہ کے مسلمان ساتھیوں کو

قرآن وحدیث کے متعلق پرچوں کا ٹھیک جواب دے کر کامیابی حاصل کرنی پڑتی تھی، لیکن ہم کو کبھی ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کا پرکٹیکل امتحان دینا نہیں پڑا۔ اس طرح کا امتحان دے کر تھیالوجی کی ڈاکٹریٹ حاصل کرنے والے لوگ وہ ایمان کی حرارت والے حضرات ہیں جو ایک شب میں مسجد تو بنا دیتے ہیں لیکن جن کا پاپی من برسوں میں بھی نمازی نہیں بن پاتا اور وہ جن کے منہ میں تو رام ہوتا ہے لیکن بغل میں چھری۔ ایسے مذہب اور دھرم کے علمار اور پجاریوں کی آبادی تو آج کل بے تحاشا بڑھ رہی ہے۔ نوجوان اکثر کتاب اور قلم کے بجائے پتھر اور خنجر لئے گھومتے نظر آتے ہیں۔ جامعہ کے طالب علموں کے ہاتھ میں جب کتاب اور قلم نہیں ہوتے تھے تب عوام کی خدمت کرنے کا ساز و سامان ہوتا تھا، گرمی کی چھٹیوں میں وہ قصبوں اور گانوؤں میں جاکر دکھی لوگوں کی سیوا کیا کرتے تھے۔

میرے وقت کے جامعہ کے رنگ روپ اور آج کل کے جامعہ کے روپ رنگ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ جامعہ کچی پکی دیواروں اور پھونس کی چھتوں والے مکانوں میں بستی تھی، یہ جامعہ اینٹ پتھر کی دیواروں اور لنٹل کی چھتوں والی عمارتوں میں بستی ہے۔ لیکن اس کے بدلے ہوئے قالب کے اندر میں نے جو جھانک کر دیکھا تو روح تو وہی پرانی نظر آئی۔ مجیب صاحب ایسے تعلیمی دنیا کے فرشتوں اور فاروقی صاحب ایسے کردار کے غازیوں کی کوشش ایک نہ ایک دن دقتوں اور مصیبتوں کو ضرور پچھاڑ دیں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی جامعہ کی انقلابی روح دفتری لال فیتے سے بری طرح بندھی ہوئی ہے اور ہم نے انگریزوں کے زمانے کی نوکر شاہی سے جو اگڑم بگڑم طور طریقہ وراثت میں پایا ہے اس کے ذلیل بوجھ کے نیچے لبی سے دبی ہوئی ہے، لیکن اس کے کرتا دھرتا اور مخلص دوستوں کے کامیاب ہوتے ہی وہ رہا ہوگی، خوب ابھرے گی اور بہت چمکے گی۔ اس وقت وہ حسین انتہا دیکھنے کو ملے گی جس کا میرے ایسے جامعہ کے اولڈ بوائز کو انتظار ہے۔

فی الحال تو مجھے یہ گستاخی بھری بات کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ حسین انتہا میں دیکھ چکا ہوں وہ تو جامعہ کی حسین ابتدا میں ہی پنہاں تھی۔

مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم

"جامعہ"

زندگی ناز و نیاز و سوز و سازِ دل میں ہے
ہائے وہ زندہ کہ جو مدفون آب و گِل میں ہے
بُو پریشاں ہو کے نکلی خیمۂ گلزار سے
کب سبک روحوں کو آسائش کسی منزل میں ہے
بادیہ گردی ہے مجنوں کے لئے سامانِ زیست
ایک جانِ تازہ ہر نظارہ محمل میں ہے
پوچھ آسانی پسندوں سے ہر آسانی کہاں؟
جو نہیں مشکل میں ہے وہ بھی بڑی مشکل میں ہے
عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہ کن کی سعیِ بے حاصل میں ہے
شیخ ہند و اجمل و جوہر کی روحِ انقلاب
جامعہ ملیہ کے سر میں، جگر میں، دل میں ہے
گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

تعلیمی ادارے

۱۔ جامعہ کالج ۲۔ ہائر سکنڈری اسکول ۳۔ مدرسہ ابتدائی	سنہ قیام	۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء
۴۔ استادوں کا مدرسہ	"	یکم اگست ۱۹۳۸ء
۵۔ بالک ماتا سنٹر	"	۱۹۵۲ء
۶۔ نرسری اسکول	"	۱۹۵۵ء
۷۔ شعبۂ انجینئرنگ	"	۱۹۵۶ء
۸۔ اسکول آف سوشل ورک	"	۱۹۶۷ء

ہوسٹل جامعہ کالج
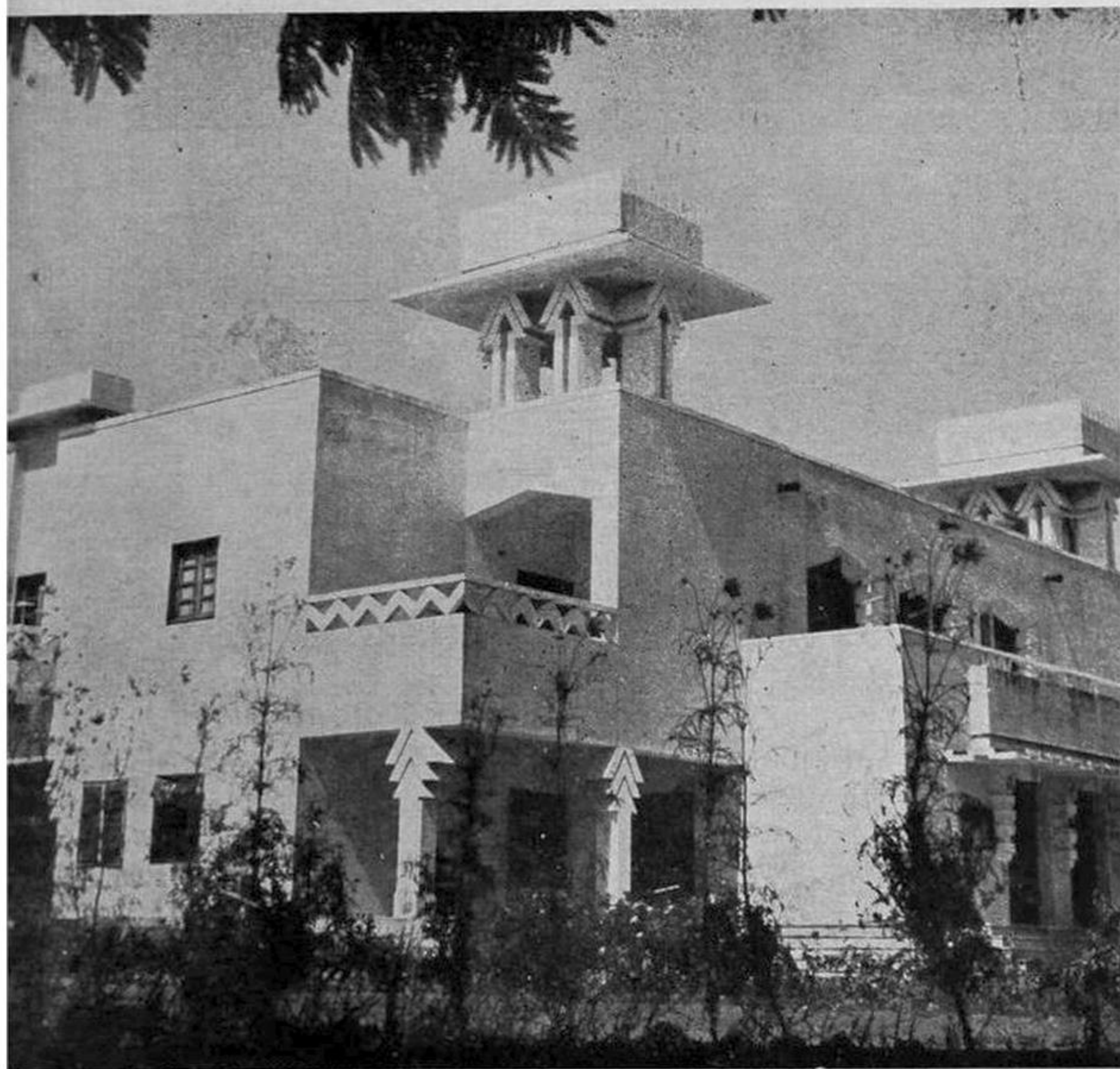
ضیاء الحسن فاروقی

جامعہ کالج

۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ علی گڑھ میں قائم ہوئی تو جامعہ کالج ہی اس کا خاص شعبہ تھا، اس طرح جامعہ کی بنیاد ہی ایک اعلیٰ تعلیم کے ادارہ کی حیثیت سے پڑی، اور اس کی یہ حیثیت اس وقت سے لے کر اب تک نہ صرف باقی ہے بلکہ آزادی کے بعد تو اور مستحکم ہوگئی ہے۔ جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کا زور تھا تو جامعہ کالج کے طلباء رضا کار بن کر تحریک آزادی کا پیغام دور دور تک پہونچاتے تھے، وہ ایک خاص سج دھج سے شہر شہر اور قریہ قریہ پھرتے اور ملک و قوم کو برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی دعوت دیتے۔ لیکن بعض رہنما ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ جامعہ جلد از جلد ایک ایسا تعلیمی ادارہ بن جائے جس کی تعلیمی حیثیت بھی مسلّم اور مستند ہو جائے، چنانچہ اس کا نصاب تعلیم مرتب ہوا اور سیاسی جوش و خروش کے کم ہوتے ہی اس کی تعلیمی ہیئت ابھرنے لگی، لیکن اب بہت سے ذہنوں میں، جن میں بزرگ بھی تھے اور نوجوان بھی، یہ سوال اٹھنے لگا کہ جامعہ کالج میں پڑھنے سے، جس کی سندیں حکومت تسلیم نہیں کرتی، دنیوی اعتبار سے کیا فائدہ ہوگا، اس پر مستزاد سیاسی اُبال کے دبنے کے ساتھ جامعہ کی مالی حالت بھی کمزور ہوگئی، اب تک اس کا زیادہ خرچ خلافت کمیٹی برداشت کرتی تھی، ۱۹۲۴ء میں جب مصطفےٰ کمال نے خلافت کے ادارہ کو ختم کر دیا تو خلافت کمیٹی کا وجود بھی خطرہ میں پڑ گیا اور خود اس کی مالی حالت کمزور ہوگئی، ان حالات میں جامعہ کے ٹرسٹیز کی اکثریت اس نتیجہ پر پہونچی کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیئے۔ لیکن استادوں اور جامعہ کالج کے طالب علموں کی ایک پرجوش جماعت

نے اس فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا اور جرمنی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے عزائم اور ٹرسٹیز کے خیالات سے مطلع کیا، انھوں نے جواب میں لکھا کہ ہمارے آنے کا انتظار کیا جائے، جامعہ بند نہ کی جائے، میں اور میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کو تیار ہیں۔
یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جامعہ کالج نے جو شروع کے دو تین سال کے علاوہ عرصہ تک ترقی و توسیع سے محروم رہا، اور اس کے معقول اسباب تھے، نہ صرف ابتدائی دور کی آزمائشوں میں جامعہ کو زندہ رکھا بلکہ بعد میں بھی جامعہ کے مختلف اداروں کو اسی سے اچھے کارکن اور استاد ملے اور جو کچھ بھی علمی کام (تصنیف و تالیف و ترجمہ) جامعہ میں اب تک ہوا ہے، اور یہ کام ملک کے دانشوروں کے نزدیک قابل قدر، وقیع، مستند اور معیاری ہے، وہ سب جامعہ کالج کے استادوں اور لائق طالب علموں ہی کا کام ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ جامعہ کالج کے اساتذہ اپنے فن میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے، اس وقت کی وہ کسی یونیورسٹی یا دارالعلوم میں ہوتے، ان کی شخصیت و قابلیت توجہ کا مرکز بن جاتی، مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد عاقل معاشیات پڑھاتے تھے، پروفیسر محمد مجیب تاریخ کے پروفیسر تھے (مجیب صاحب تو آج بھی کالج میں ایم اے کی کلاسیں لیتے ہیں)، کیلاٹ صاحب انگریزی کے اور ڈاکٹر سید عابد حسین اردو ادب کے استاد تھے، مولانا اسلم جیراجپوری اور مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب قرآن و حدیث و تاریخ اسلام کا درس دیتے تھے اور مولانا سید محمد سورتی عربی ادب پڑھاتے تھے۔ جامعہ کالج کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اساتذہ اپنے طالب علموں .... میں اعلیٰ تہذیبی اقدار کی محبت کا بیج بوتے تھے، انھیں ان اقدار کی چاکری کے لئے تیار کرتے تھے، سادہ زندگی، خلوص اور جذبۂ ایثار کی عملی شکل بن کر اپنے نوجوان طالب علموں کو فکر و عمل کی دعوت دیتے تھے، اکثر طالب علم، کالج سے فارغ ہو کر، اپنے استادوں کی رہنمائی میں جامعہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتے تھے، اور جو یہاں سے چلے جاتے تھے وہ اپنے اپنے حلقہ میں، تجارت، صحافت، معلمی، سوشل ورک یا سیاسی کام جو کچھ بھی وہ کر رہے ہوتے، تہذیب و

شرافت کا ایک معیار قائم رکھتے اور کوشش کرتے کہ اپنے کام سے مادر علمی کا نام اونچا کریں
ذاکر صاحب اور شفیق صاحب کو جامعہ چلانے کے لئے سرمایے کی ضرورت رہتی تھی، جامعہ کالج
کے ذمہ دار طلبا، جو ملک کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، وہ ان بزرگوں کی مدد کرتے۔
یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک جامعہ کو جامعہ کالج ہی نے اعلیٰ تعلیم کا
ادارہ بنائے رکھا، اور قائل ہونا پڑتا ہے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور ان کے ساتھیوں کی بصیرت
اور دور اندیشی کا کہ انھوں نے کسی منزل میں بھی، اس وقت بھی جب جامعہ کالج میں طالب علموں
کی تعداد بیس پچیس ہی ہوتی تھی، کالج کو بند نہیں ہونے دیا۔ اگر کالج نہ ہوتا تو آج یو، جی، سی ایکٹ کے
سیکشن ۳ کے تحت یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر کے جامعہ کے لئے توسیع و ترقی کا کوئی امکان نہ ہوتا۔
شروع میں تو جامعہ کالج میں بی اے آنرز اور ایم اے تک تعلیم ہوتی تھی، سائنس کی
آنرز کلاسیں بھی تھیں، لیکن رفتہ رفتہ حالات کی دشواریوں کے سبب بی اے تک کی تعلیم رہ گئی،
کالج کا نصاب چار سال کا تھا، دو سال جامعہ سینیر (انٹرمیڈیٹ) اور دو سال جامعہ سندی (بی اے)
کے، لیکن انگریزی، اردو ادب، اسلامیات یا ہندو اخلاقیات، ہندی اور سماجی علوم (معاشیات،
سیاسیات، تاریخ وغیرہ) کا ایک ایسا مربوط و معقول نصاب جامعہ نے تیار کیا تھا کہ جامعہ کے
گریجویٹ کا معیار تعلیم اس وقت کی سرکاری یونیورسٹیوں کے بی اے سے کہیں زیادہ اونچا تھا، اس
کے علاوہ کالج میں تفویضی کام (Assignments) کا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا تھا، بی اے
کے طالب علموں کے مقالے اپنے معیار کے اعتبار سے بہت اچھے ہوتے تھے، بعض مقالے تو
کتابی شکل میں شائع ہوئے اور تبصرہ نگاروں نے انھیں علم و ادب میں قابل قدر اضافہ تصور کیا۔ یہ
جامعہ کی اپنی خصوصیت تھی جسے ملک میں بہت بعد میں قابل توجہ سمجھا اور اپنایا گیا اور وہ بھی ادھورے
طور پر، جامعہ کالج میں ۱۹۵۵ء تک مقالوں کا معیار اچھا رہا، بعد میں جوں جوں طلبا کی تعداد بڑھنے
لگی، معیار قائم رکھنا مشکل ہو گیا، اس لئے کہ کالج کے یہ طویل مقالے کم و بیش اس معیار کے ہوتے تھے
جیسے آج کل بی۔ اے آنرز اور ایم اے کے Dissertations ہوتے ہیں، لیکن اب

جبکہ کالج میں ۱۹۶۸ء سے آنرز کے کورس جاری ہو گئے ہیں جن میں طالب علموں کی ایک محدود تعداد داخل کی جاتی ہے، طویل مقالہ ایک پرچے کے طور پر شامل نصاب کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے متعلقہ طالب علموں کے مطالعہ میں وسعت پیدا ہوگی اور تعلیمی معیار اونچا ہوگا، اس سے کالج میں جو علمی فضا بنے گی اس سے بی، اے اور بی ایس سی کی سطح کے مضامین کی تدریس پر بھی اچھا اور مفید اثر پڑے گا۔ یوں تو کالج کی ہر کلاس کا ہر سال یونیورسٹی امتحان ہوتا ہے، لیکن طالب علموں کے لئے کسی امتحان کے پاس کرنے کے واسطے ضروری ہوتا ہے کہ وہ انٹرنل السیسمنٹ (Internal Assessment) میں جو چھوٹے چھوٹے تفویضی کاموں اور کلاس ٹسٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے کم از کم ۳۳ فیصدی نمبر حاصل کریں۔ عام طور پر ہر مضمون کے مجموعی نمبروں کے ۲۰ فیصدی نمبر اس کے لئے متعین ہیں۔ سنتے ہیں کہ اب دوسری یونیورسٹیاں بھی اس پر عمل پیرا ہو رہی ہیں اور بعض نے تو اس نظام کو اپنا لیا ہے۔

جامعہ کالج میں کیلاٹ صاحب مرحوم کے زمانے میں کھیلوں کا معیار بہت اچھا تھا، وہ خود بہت زیادہ دلچسپی لیتے، طالب علموں کے ساتھ کھیل میں شریک رہتے، اُن کی ہمت افزائی کرتے، جو کوئی تساہل سے کام لیتا، اُسے چاق چوبند اور مستعد بنانے کے جتن کرتے۔ شاید یہ انھیں کی ڈالی ہوئی روایت ہے کہ جامعہ کالج میں فٹ بال، ہاکی، کرکٹ اور والی بال کی ٹیمیں آج بھی اچھی خاصی ہیں، ہمارے کھلاڑی کئی سال سے انٹر ورسٹی میچوں میں شریک ہوتے ہیں اور جہاں جاتے ہیں اپنے کھیل کے ساتھ تہذیب اور بھلمنساہت کا گہرا اثر چھوڑ آتے ہیں۔ جامعہ کالج میں ہر مذہب کے طالب علم اور طالبات پڑھتی ہیں، اور کبھی کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہوتی جس سے جامعہ کی سچی حب الوطنی اور متوازن مذہبیت پر کوئی اثر پڑے۔ ۱۹۶۷ء میں باہر کے بعض سیاسی عناصر نے جامعہ کالج میں گڑبڑ کرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں انھیں کچھ زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اس لحاظ سے دوسری یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے مقابلہ میں ہمارے طلبہ کسی قدر قدامت پسند ہیں، آج کے حالات میں یہ قدامت پسندی لائق ستائش ہے۔

جامعہ کالج میں طالب علموں کی یونین کو انجمن اتحاد کہتے ہیں، اس انجمن کی عمر بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ جامعہ کی، انجمن اتحاد کا ایک آرگن بھی ہے جسے جوہر کہتے ہیں، گذشتہ پچاس سال میں اس انجمن نے جامعہ کی قدر و قیمت بڑھانے میں نمایاں کام انجام دئے ہیں، اس کے پاس ایک اچھی خاصی لائبریری تھی، جوہر کے کئی خاص نمبر چھپے اور علمی و ادبی دنیا میں مقبول ہوئے، اس کے قلمی شمارے بھی خاصے کی چیز ہوا کرتے تھے، انجمن کے پلیٹ فارم سے ملک وملت کی اہم شخصیتوں نے جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کو خطاب کیا ہے۔ یہ انجمن اب بھی ہے اور اس کے اراکین کی تعداد پہلے کے مقابلہ میں دس بارہ گنی زیادہ ہے، لیکن اب اس میں وہ بات نہیں جو پہلے تھی، جس طرح قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں انحطاط نمایاں ہے، انجمن بھی اس کی زد میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں اور دارالعلوموں میں وہ روایتیں ختم ہوگئیں جنھیں انجمن اتحاد کی طرز کی اسٹوڈنٹس یونینوں نے ایک عرصہ کی کاوشوں کے بعد قائم کی تھیں۔

جامعہ کالج میں، جامعہ کے دوسرے اداروں کی طرح کہ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بنیادی اصول رہا ہے، شروع ہی سے ذریعہ تعلیم اردو ہے، غلامی کے دور میں اسے پسماندگی کی ایک علامت تصور کیا جاتا تھا اور جتنی بھی سرکاری یونیورسٹیاں تھیں انگریزی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھیں، لیکن ماہرین تعلیم اس وقت بھی کہتے تھے کہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم اُن کی اپنی مادری زبان ہی میں ہونی چاہیئے کہ اس سے ان کی ذہنی بالیدگی اور صلاحیتوں کی ترقی میں مدد ملتی ہے، آزادی کے بعد بھی جب رفتہ رفتہ اس اصول کو عملی شکل دینے کی کوشش ہوئی اور یہ کہا جانے لگا کہ یونیورسٹیوں میں بھی ذریعہ تعلیم علاقائی زبانیں ہونی چاہئیں تب بھی جامعہ میں اردو ذریعہ تعلیم رہی اور آج بھی ہے، اور یو، جی، سی اور حکومت نے جامعہ کے اس موقف کو مان لیا اور اب تو ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں نے جامعہ کی سندوں اور سرٹیفکٹوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہاں دکھ اس بات کا ہے کہ خود اردو والوں نے اردو کو چھوڑ دیا ہے اور کالج میں مختلف صوبوں سے اُردو جاننے والے طلبہ کی تعداد کم آتی ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا

چاہیئے کہ جامعہ میں آن طالب علموں کو کوئی دقت ہوتی ہو جو اپنا medium of Examination یعنی امتحان کی زبان اُردو کے بجائے ہندی یا انگریزی رکھنا چاہتے ہیں، جامعہ کے قاعدوں میں اس کی پوری گنجائش ہے۔ آزادی کے بہت پہلے سے جامعہ میں سہ لسانی فارمولے پر عمل ہو رہا ہے، یہاں کسی زبان کو کسی زبان سے بیر نہیں ہے، ذریعۂ تعلیم چونکہ اردو زبان ہے اس لئے تمام غیر اردو والوں کو کالج میں ایک خاص معیار تک اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، اس طرح بھی جامعہ اپنے تہذیبی مقاصد کی خدمت میں لگی ہوئی ہے

مزید برآں جامعہ کالج کے تحت دہلی کی چار بستیوں میں اردو مرکز قائم ہیں، ان میں سے تین بستیاں تو خاص اس قسم کی ہیں کہ ان میں پاکستان سے آئے ہوئے ہمارے بھائی آباد ہیں، ان مرکزوں میں ایک ایک کتب خانہ ہے جس کی رکنیت کی کوئی فیس نہیں، کوئی زرِ ضمانت نہیں، لوگ اپنے شوق سے آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، کتابیں دیکھتے ہیں اور پھر جاری کر کے اپنی پسند کی کتابیں لے جاتے ہیں، دو مرکزوں میں اردو کی تعلیم بھی ہوتی ہے، یہ تجربہ بہت کامیاب ہے، اور اس سے اردو زبان اور اردو تہذیب کی اشاعت کے نئے نئے گوشے سامنے آئے ہیں، اردو مراکز ۱۹۶۰ء میں حکومت کشمیر کی ایک مخصوص گرانٹ سے قائم کئے گئے تھے، پھر حکومت ہند سے ان کے لئے گرانٹ ملنے لگی اور ان کا بجٹ جامعہ کالج کے بجٹ کا ایک حصہ بن گیا۔

مذہبی تعلیم اس وقت بھی کالج کے نصاب کا ایک لازمی جزو تھی جب جامعہ میں مدرسہ ابتدائی وغیرہ کی جماعتیں نہیں تھیں، جامعہ کے تعلیمی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں سے ایسے نوجوان نکلیں جو ذمہ دار شہری ثابت ہوں، اچھے محب وطن ہوں، اگر مسلمان ہوں تو سچے مسلمان ہوں اور ہندو ہوں تو سچے ہندو ہوں، اسی لئے مذہبی تعلیم پر جو اچھی اخلاقی تعلیم کی بنیاد ہے، جامعہ میں پوری توجہ دی جاتی تھی، نوجوانوں کی ذہنی صلاحیت اپنی بالیدگی اور آبیاری کے لئے اپنے تہذیبی سرچشموں ہی کی طرف دیکھتی ہے، جامعہ چلانے والوں کے سامنے ہمیشہ سے یہ بات

رہی ہے، اس لئے مسلمان طالب علموں کے لئے اسلام کی اور ہندو طالب علموں کے لیے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی تھی، لیکن ۱۹۴۹ء میں جب آزاد ہندوستان کا سیکولر دستور نافذ ہوا اور جب جامعہ نے یہ طے کیا کہ اب اپنی حکومت سے گرانٹ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تو مذہبی تعلیم لازمی نہیں رہ سکتی تھی، پھر بھی اب تک عملاً صورت حال یہ ہے کہ کالج میں طلبار کی تقریباً ۹۵ فیصدی تعداد اسلامیات یا ہندو اخلاقیات کا کورس پڑھتی ہے۔

اس وقت کالج میں جن کورسنر اور مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

کورسنر: (۱) پری یونیورسٹی کورس (۲) بی اے (سہ سالہ کورس) (۳) بی اے آنرز (ہندی، معاشیات، سیاسیات اور تاریخ) (۴) بی ایس سی (سہ سالہ کورس: گروپ اے یعنی فزکس، کیمسٹری، ریاضی) (۵) ایم، اے (تاریخ) (۶) پی، ایچ، ڈی (تاریخ)۔

مضامین: (۱) اسلامیات (۲) ہندو اخلاقیات (۳) ہندوستان کے مذاہب اور تہذیب (۴) اردو (ابتدائی کورس) (۵) اردو زبان (۶) جنرل ایجوکیشن (۷) انگریزی عام (۸) اردو ادب (۹) ہندی ادب (۱۰) انگریزی ادب (۱۱) عربی (۱۲) فارسی (۱۳) تاریخ (۱۴) معاشیات (۱۵) جغرافیہ (۱۶) سیاسیات (۱۷) علوم اسلامیہ (اسلامک اسٹڈیز) (۱۸) عام سائنس (برائے پری یونیورسٹی کورس) (۱۹) فزکس (۲۰) کیمسٹری (۲۱) ریاضی۔

امسال جون کے مہینے میں کالج کی طرف سے یو، جی، سی کو لکھا گیا تھا کہ وہ کالج میں کچھ اور مضامین میں آنرز اور ایم، اے کورسنر شروع کرنے کی اجازت دیں، معلوم ہوا ہے کہ یو، جی، سی نے مندرجہ ذیل نئے کورسوں کے شروع کرنے کی اجازت دے دی ہے، انشاء اللہ آئندہ تعلیمی سال سے یہ کورس شروع کر دئے جائیں گے۔

(۱) ایم، اے (اردو ادب) (۲) بی، اے آنرز (جغرافیہ) (۳) بی، اے آنرز (عربی) (۴) بی، اے آنرز (فارسی) (۵) بی، اے آنرز (انگریزی ادب) (۶) بی ایس سی آنرز (فزکس) (۷) بی ایس سی آنرز (کیمسٹری) (۸) بی ایس سی آنرز (ریاضی)۔

کالج میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتی ہیں، پرانے خیال کے مطابق یہ یہ ایک بدعت ہے لیکن اسے اب عام طور پر ہماری جماعت نے تسلیم کرلیا ہے، لیکن اس سے کالج کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، خوشی ہوتی ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ماں باپ جامعہ میں اپنی لڑکیوں کو بھیج کر مطمئن ہو جاتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کالج کے استادوں کی ذمہ داری کتنی بڑی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر طلبار اور طالبات خود اسے محسوس کریں کہ ان کے حدود کیا ہیں اور آزادی کا مطلب یہ ہے کہ بہت سی پابندیاں آپ اپنے اوپر عاید کرلی جائیں تو استاد کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے، جامعہ میں ایسی ہی ذمہ داری کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ طالب علموں اور استادوں میں بڑا قریبی رشتہ ہو، کالج میں طالب علموں کی تعداد بڑھنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم ہے، اور کالج چاہتا ہے کہ ایک خاص حد سے زیادہ تعداد نہ بڑھے تاکہ کالج میں یہ ماحول قائم رہے جس کی بنا پر استاد، طلبہ اور طالبات، سب لوگ اس ادارہ کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور یہاں کی زندگی کو ایک خاندان کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

عبدالحق خاں

ہائر سکنڈری اسکول

جامعہ کے قیام کے ساتھ ہی مدرسہ ثانوی قائم ہوا تھا، جس میں دسویں کلاس تک تعلیم دی جاتی تھی، اگرچہ شروع ہی سے مدرسہ ثانوی کا نصاب تعلیم اور طریق تعلیم دوسرے ہائی اسکولوں سے کافی مختلف اور جدید تعلیمی نظریات پر مبنی تھا، چنانچہ ایک زمانے تک یہاں تفویضی طریقہ رائج تھا اور یہ کوشش کی گئی کہ مدرسے کا پورا انتظام ڈالٹن اصول پر آجائے، مگر حالات کی تبدیلی اور زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اب ۱۹۵۶ء سے اس میں گیارہویں کلاس تک تعلیم دی جانے لگی ہے اور نصاب تعلیم میں بہت سے مضامین کا اضافہ کر دیا گیا یعنی جدید اصطلاح میں جسے متنوع نصاب (DIVERSIFIED COURSE) کہتے ہیں، وہ آج کل جاری ہے اور مدرسہ ثانوی کو اب ہائر سکنڈری اسکول کہتے ہیں۔

ایک سال کی توسیع اس وجہ سے مناسب تھی کہ میٹرک کا دو سال کا نصاب طلبار کے مزاج کی مناسبت سے تعلیم کے صحیح نتائج برآمد کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔ ہم نے ہائر سکنڈری تعلیم کی تمام مدت پر اس لئے نظر ثانی کی اور اس کی ہیئت کو اس لئے بدلا تاکہ طلبار کو اچھی تربیت دی جاسکے، وہ اپنی صلاحیتوں کا اچھا استعمال سیکھ سکیں، انھیں اپنی تعلیمی کاوشوں کا اچھا پھل ملے اور وہ مستقبل کے لئے اپنے آپ کو بہتر طریقہ پر تیار کر سکیں۔

متنوع نصاب

ہمارے ثانوی مدرسوں کا یہ طریقہ کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علم کا صرف ایک ہی میدان ہو جس میں تمام طلبار کم وبیش ایک نصاب کے مطابق کام کریں تمام طلبار کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا۔ اس لئے ایک مدرسہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مختلف النوع نصاب کا انتظام کرے اور ایسے مشاغل کا انتظام کرے جو تمام طلبار کے مزاج، صلاحیتوں اور دلچسپیوں کے مطابق ہوں اور انھیں پروان چڑھائیں۔ اسی لئے جامعہ ہائر سکنڈری اسکول میں متنوع نصاب جاری کیا گیا۔ ہائر سکنڈری کلاسوں میں مضامین کے ۲ دو گروپ ہیں، ایک آرٹس گروپ اور دوسرا سائنس گروپ۔ آرٹس اور سائنس گروپ کے مضامین کو ۲ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ــــ حصہ اول اور حصہ دوم ــــ حصہ اول کا امتحان دسویں کلاس کے بعد اور حصہ دوم کا امتحان گیارہویں کلاس کے بعد ہوتا ہے۔ جامعہ ہائر سکنڈری امتحان کو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں نے داخلے کے لئے تسلیم کرلیا ہے۔

تعلیمی مشورے (ایجوکیشنل گائڈنس)

ہمارے موجودہ تعلیمی نظام کی ایک اہم خرابی یہ بھی ہے کہ بچوں کی انفرادی صلاحیتوں سے مناسب کام نہیں لیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ عظیم قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ تعلیم کے دو اہم مقاصد یعنی سماجی اور پیشہ وری کو ابھارنا ہے اس کے لئے ہر بچہ پر مناسب انفرادی توجہ دینی چاہئے۔ بچوں کی صلاحیتیں اسی وقت ابھر سکتی ہیں اور نشو ونما پا سکتی ہیں جب اسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ ان کا اظہار کرسکیں۔ ان مقاصد کو مختلف منازل میں مندرجہ ذیل مناسب مشورے دیکر حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(الف) کلاس میں مناسب مضامین اور ان سے متعلق مختلف مضامین چننا۔

(ب) اسکول چھوڑنے کی کلاس میں پیشے کا چننا اور ایک خاص ذریعہ معاش کو پسند کرنا اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ اس کی اپنی صلاحیتیں اور حالات کیا ہیں۔

ہم نے پہلے اسٹیج پر مشورہ دینے یعنی گائڈنس کا کام شروع کیا ہے جس میں امتحان کے نتائج، اساتذہ کی رائے اور والدین کی خواہش کے پیش نظر طلبا، کو اپنے اپنے گروپ منتخب کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔

امتحان کا نظام

امتحان کے طریقے کو بہتر بنانے کے لئے ہم نے ایک طریقہ کی ابتدا کی ہے اور امتحان کی اس طرح تنظیم کی ہے کہ ایک طالب علم کے تمام سال کے کام کو مناسب طریقے پر جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ صرف ایک سالانہ امتحان کے بوجھ کو طلبا، کے ناتواں کاندھے برداشت نہیں کر سکتے اس لئے اس بوجھ کو اس طرح اٹھانے کے قابل بنایا گیا ہے کہ ایک امتحان کے بجائے سال میں کئی امتحانات رکھے گئے ہیں۔ ماہانہ جانچ اور ریکارڈ کا طریقہ جاری کیا گیا ہے۔

اساتذہ کے جلسے اور تبادلۂ خیال

کسی بھی ادارے کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس کے نگران کو اساتذہ کا کتنا تعاون حاصل ہے اور تعاون کا سرچشمہ درحقیقت وہ تعلیمی آزادی اور آزاد تبادلۂ خیال ہے جو ادارے اور ادارے کے مسائل سے متعلق عام طور پر ہوتا رہتا ہے۔

اسکول میں انجمن اساتذہ ہے، تعلیمی مسائل پر اس انجمن میں بحث ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ماہانہ جانچ کے بعد مضامین کے اساتذہ کی کانفرنس بھی بلائی جاتی ہے تاکہ فرداً فرداً مختلف طلبا کے مسائل پر غور کیا جا سکے۔

سائنس کی تجربہ گاہیں

وزارت تعلیم نے مدرسہ کو پچاس ہزار روپے کی گرانٹ دی تھی تاکہ سائنس کی تجربہ گاہوں کو بہتر بنایا جاسکے۔ مدرسہ میں فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی تجربہ گاہیں تمام ضروری سامان سے آراستہ ہیں۔

تعلیمی کلب

ہمارے طلبار کے مشاغل بلاواسطہ مختلف مضامین کے کلبوں سے متعلق ہیں اور یہ کلب ہمارے ادارے میں بہت مقبول ہیں، ایک طالب علم بیک وقت دو کلبوں کا ممبر ہو سکتا ہے۔ کلب کے جلسے ہفتے میں ایک دفعہ اوقات تدریس کے بعد ہوتے ہیں۔ پروجیکٹ اور دیگر غیر نصابی مشاغل انہی کلبوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

انجمن طلبار

آج کی ثانوی تعلیم پر طلبار کو جمہوریت اور تعاون کا سبق دینے کی زبردست ذمہ داری ہے اور اسکول کی حکومت طلبار میں شہریت کی تربیت کا ایک موثر ذریعہ ہے ہمارے اسکول میں ایک انجمن طلبار ہے جو اسکول کے تمام مشاغل کی تنظیم کرتی ہے۔ یہ انجمن ان انجمنوں کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی سے کام کرتی ہے اور زیادہ اختیارات رکھتی ہے جو عام طور سے مختلف اسکولوں میں ہوتی ہیں۔

اس انجمن کی نگرانی میں مدرسہ کا "ایک دن کا مدرسہ" اور "سالانہ دن" بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔

کھیل اور اسپورٹس

کھیل کمیٹی اسکول میں کھیلوں اور اسپورٹس کا انتظام کرتی ہے۔ فٹ بال، ہاکی،

کرکٹ ، والی بال اور باسکٹ بال کے کھیل کا معقول انتظام ہے۔ چھٹی اور فرصت کے اوقات میں کامن روم میں اِن ڈور کھیلوں کا انتظام ہے ۔ مدرسہ میں کھیل کا معیار کافی بلند ہے ۔

"تعلیم کی تین رسمی تقسیموں یعنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ میں ثانوی تعلیم کا تعلق تمدنی زندگی اور اس کے مقاصد سے بہت ہی گہرا ہے ، اس لیے کہ ابتدائی تعلیم تو بچے کو اس عمر میں دی جاتی ہے جبکہ اس کا شعور مقابلۃً بہت محدود ہوتا ہے اور اس کی ترکیب نفسی میں وحدت ہوتی ہے ، وہ تمدن کی تحلیل مختلف اجزا میں نہیں کر سکتا ، نہ اس پر تنقیدی نظر ڈال سکتا ہے ، وہ تو زیادہ تر اپنے ماحول کی زندگی سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے اس لیے اس منزل میں معلم کا کام بہت کچھ یہ ہوتا ہے کہ بچے کے لیے ایسا مفید تعلیمی ماحول مہیا کر دے جس میں اس کی جسمانی اور ذہنی قوتیں مجموعی طور پر ابھر سکیں .....

ثانوی تعلیم کی منزل اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں تمدن کی تفسیر اور ترجمانی کا کام جو معلّم کو ہر منزل میں کرنا پڑتا ہے، خاص طور پر مشکل ہو جاتا ہے، یہاں معلّم کا کام یہ ہے کہ تمدنی زندگی کو مختلف اجزا میں تحلیل کر سکے، نوجوان کی تنقیدی قوت کو بھی ابھارے، مگر صحیح راہ سے بھٹکنے بھی نہ دے، اس کی انفرادیت کا احترام بھی کرے اور اُسے جماعتی زندگی سے ربط دینے کی کوشش بھی ۔ غرض یوں تو تعلیم کی ہر منزل میں تمدنی نصب العین کا رکھنا ضروری ہے، لیکن ثانوی منزل میں معلّم کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اس نصب العین کا واضح تصور اور اس سے دلی لگاؤ رکھتا ہو اور اس کی تفسیر و ترجمانی بخوبی کر سکے ۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین

آزاد رسول

مدرسہ ابتدائی

(۱۹۴۸ء تا ۱۹۷۰ء)

سلور جوبلی کے بعد جب مدرسہ کھلا تو ملک تقسیم ہو چکا تھا اور حالات بدل چکے تھے۔ اعلیٰ متوسط طبقہ جس کے بچے جامعہ میں تعلیم پاتے تھے ہندوستان کو خیرباد کہہ کر جا چکا تھا۔ پورے مدرسے میں مقیم طلبار کی تعداد پچاس، پچپن کے قریب رہ گئی تھی البتہ کالکا کیمپ کے بچوں کی وجہ سے غیر مقیم طلبار کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مدرسے کے اجتماعی کردار کو باقی رکھنے کے لئے سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح مقیم طلبار کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اساتذہ کے مختلف دفود ملک کے مختلف حصوں میں بھیجے گئے اور سرپرستوں کو اطمینان دلایا گیا کہ اب حالات بہتر ہیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ جوں جوں ملک کے حالات اطمینان بخش ہوتے گئے مدرسے میں مقیم طلبار کی تعداد بڑھتی رہی اور چند ہی سال کی کوشش سے اچھی خاصی تعداد ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مدرسے میں پھر سے مختلف مشاغل پر کام شروع ہو گیا۔ کئی نئے مشاغل شروع ہوئے جیسے ایک دن کا مدرسہ، کھلی ہوا کا مدرسہ، خوانچہ، تقسیم انعامات کے موقع پر سالانہ جلسہ اور بچوں کی حکومت وغیرہ۔ پرانے مشاغل کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر اور پچھلے تجربوں کی روشنی میں زیادہ بہتر طریقے پر چلایا گیا لیکن ترقی کی رفتار کا اندازہ لگانے میں تھوڑی سی دشواری یہ ہوتی ہے کہ لوگ نئے کاموں اور ان کی تعداد کو سامنے رکھ کر ترقی کا اندازہ لگاتے ہیں۔ جاری کاموں کو بہتر اور عمدہ طریقے سے کرنے کو ترقی نہیں سمجھتے۔ بے شک نیا کام شروع کرنا بڑی ہمت اور جانفشانی کا کام

ہے لیکن پرانے کام کو جاری رکھنا اور اس میں برابر گہرائی اور وسعت پیدا کرتے رہنا اس سے بھی زیادہ محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ بہرصورت جوبلی کے بعد جب حالات سازگار ہو گئے، طلبار کی تعداد خاصی ہو گئی اور پژمردہ دلوں میں کچھ جان سی آئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن کر علی گڑھ چلے گئے اور ان کی جگہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کام شروع ہوا۔ سب سے پہلے ضرورت اس امر کی تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی جائے۔ اچھے نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اساتذہ کی سوجھ بوجھ اور ان کے تجربوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ہر جماعت کے استاد درجہ سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اپنی جماعت کا نصاب تیار کرے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کی ترقی کے میدان میں یہ ایک نیا قدم تھا۔ نصاب تعلیم میں کچھ کمیاں ضرور رہ گئیں لیکن یہ تجربہ اپنی مثال آپ ہے۔ نصاب تعلیم بناتے وقت استادوں کے ذہن میں یہ بات رہی کہ نصاب تعلیم بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے، کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے ذریعے بچوں میں غور و فکر اور تحقیق و تجسس کا جذبہ پیدا ہو تاکہ وہ بڑے ہو کر اپنے ملک کے ذمے دار شہری اور بنی نوع انسان کے سچّے خادم بن سکیں۔ نصاب میں طریقۂ تعلیم سے متعلق بھی مناسب ہدایات دی گئیں کہ جہاں تک ممکن ہو کسی مشغلے یا حرفے سے مربوط کر کے نصاب کو پورا کرانے کی کوشش کی جائے۔ اچھے نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ حالات اور ضروریات کے پیش نظر اس میں مسلسل تبدیلی ہوتی رہے۔ اس بنا پر ۱۹۶۵ء میں استادوں کی مدد سے نصاب تعلیم پر پھر سے نظرِ ثانی کی گئی۔ تعلیمی معیار میں اضافہ کے خیال سے ریکارڈ کے نمبروں کی تعداد تو اتنی ہی رکھی گئی البتہ اس کی تقسیم اس طرح کر دی گئی کہ ۲۰ نمبر ماہانہ جانچ کے رکھے گئے اور ۲۰ نمبر وقت کی پابندی، کام کی صحت اور صفائی ستھرائی کے۔ سماجی علوم کے امتحان کے پرچے objective ٹائپ کے بنائے جانے لگے۔

شروع میں اجتماعی منصوبوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، پورے مدرسے میں ایک

آدھ استاد اپنے درجہ میں کوئی جماعتی منصوبہ چلا لیتا تھا سلور جوبلی کے موقع پر کوشش کی گئی کہ ہر جماعت میں کوئی نہ کوئی پروجیکٹ چلایا جائے اور اس کی نمائش ہو۔ جوبلی کے بعد رفتہ رفتہ جب کام معمول پر آگیا تب بھی ہر سال ہر جماعت میں کوئی نہ کوئی وقتی پروجیکٹ چلانا لازمی سا ہوگیا۔ استاد اور طلبار نئے نئے منصوبوں کا پلان بناتے رہتے۔ مدرسے میں جب پروجیکٹ چلتے تو چاروں طرف زندگی اور چہل پہل نظر آتی۔ طلبار اور اساتذہ دن رات لگ کر مقررہ مدت میں اپنے کام کو پورا کرتے۔ تعلیمی میلے کے موقع پر اس کی نمائش کرتے۔ یوں تو مدرسے میں وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی پروجیکٹ کے کام کی نمائش شروع ہی سے ہوتی رہی لیکن ادھر پچھلے دس پندرہ برس سے مدرسے میں جو میلے کے موقع پر نمائش ہوتی ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر سال بیس پچیس پروجیکٹ کی نمائش ایک ساتھ ہوتی ہے۔ نمائش کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی ڈرامہ وغیرہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور ٹی اسٹال بھی لگایا جاتا ہے۔ ایک ساتھ اتنے سارے کام کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ استاد مہینے دو مہینے دن رات کام میں لگے رہتے، تب کہیں جاکر تمام کاموں کی وقت پر تکمیل ہو پاتی، جب کام ختم ہوتا تو اساتذہ اپنے کام کو دیکھ کر خود ہی خوش ہو لیتے اور سمجھتے کہ کام اپنا انعام آپ ہے۔ ۱۹۵۶ء میں وزارت تعلیم کی خواہش پر یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کو کس درجہ سے شروع کیا جاسکتا ہے پنجم میں گاندھی جی پروجیکٹ چلایا گیا۔ تجربہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ پانچویں جماعت سے گاندھی جی کی تعلیمات کو شروع کیا جاسکتا ہے اور عمل درآمد کے خیال سے پروجیکٹ کی رپورٹ کی ایک ایک نقل مختلف ریاستوں میں بھجوائی گئی۔ پروجیکٹ کے کاموں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں وزارت تعلیم کی خواہش پر آدمی پروجیکٹ، تہوار پروجیکٹ اور ہمالیہ کی مہمیں پروجیکٹ، ہالینڈ، اٹلی اور جاپان میں نمائش کے لئے بھیجے گئے۔

جہاں تک مستقل کاروباری شعبوں کا تعلق ہے ۱۹۴۸ء کے بعد ان کا کام بہت پھیل گیا

اس لئے ان کے حسابات کو ٹھیک طرح سے رکھنے کی غرض سے با قاعدہ ایک محرّر کا تقرر کیا گیا۔
اس کے علاوہ ایک مستقل شعبہ چڑیا خانہ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۸ء سے پہلے مدرسے میں خوانچہ برائے نام تھا بعد میں مدرسے کی ضرورت کے پیشِ نظر خوانچے کے کام کو ذرا باقاعدگی سے شروع کیا گیا اور سوم کے بجائے یہ کام پنجم جماعت کے طلبار کے سپرد کیا گیا۔ روزمرّہ کے کام کے علاوہ سال میں تعلیمی میلہ اور عید بقرعید کے موقع پر خوانچے کی طرف سے پابندی سے ٹی اسٹال لگتا۔ بچے بہت سلیقے سے اس کا انتظام کرتے۔ بعض دفعہ اتنا منافع ہو جاتا کہ اس رقم سے طلبار کو آگرے وغیرہ کی تعلیمی سیر کا موقع مل جاتا، جب خوانچے کا کام اور بھی زیادہ پھیل گیا تو اس کے لئے الگ سے ایک مستقل جگہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ کئی سال سے بچوں کی دوکان اور خوانچے کا منافع جمع تھا اس رقم سے بچوں کے لیے ایک خوب صورت سا کینٹین بنوایا گیا۔ کینٹین کے بن جانے سے مدرسے کی ایک اہم ضرورت پوری ہوگئی اور طلبار کو کھانے پینے کی تمام چیزیں صاف ستھری، اچھی اور مدرسے کے احاطے کے اندر ہی ملنے لگیں۔ سلور جوبلی سے ایک سال قبل مدرسے میں مرغی خانے کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ اس کا کام خاصا پھیل گیا لیکن بچوں کے لیے اس کو منافع بخش طریقے پر چلانا ذرا مشکل تھا اس لئے مجبورًا ۱۹۶۴ء میں مرغی خانہ ختم کر دیا گیا۔

سلور جوبلی کے موقع پر تعلیمی نمائش میں کچھ سانپ اور دوسرے کیڑے وغیرہ رکھے گئے۔ ان چیزوں کو بعد میں ایک کمرے میں رکھ کر مدرسے میں ایک شعبے یعنی میوزیم کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ بچوں میں سائنٹفک رجحان پیدا کرنے میں مدد ملے۔ رفتہ رفتہ میوزیم میں طلبار کی جمع کی ہوئی اور بازار سے خریدی ہوئی چیزوں کا خاصا اضافہ ہو گیا۔ ۱۹۶۴ء میں میوزیم کو نیچر اسٹڈی روم میں بدل دیا گیا اور تھوڑے دنوں میں کافی سامان جمع کر لیا گیا۔

میوزیم کی طرح سلور جوبلی سے ایک سال قبل مدرسے کے قریب ایک بڑے سے ٹیلے پر جہاں آج کل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کا مزار ہے، سورج کا خاندان، چاند کی

مختلف شکلیں، موسم کی تبدیلی اور اسی قسم کے دوسرے ماڈل بنائے گئے اور ایک نئے شعبے رصدگاہ کی بنیاد پڑی۔ کام بہت مفید تھا لیکن ہر سال بارش میں تمام ماڈل خراب ہو جاتے، اتنا روپیہ نہیں تھا کہ باقاعدہ رصدگاہ بنائی جاسکے اس لیے چند ہی سال میں یہ شعبہ ختم کر دیا گیا۔

مدرسے میں بچوں کا کتب خانہ شروع ہی سے ہے۔ کسی ایک استاد کی نگرانی میں یہ شعبہ چلتا تھا۔ باقاعدہ الگ سے لائبریرین نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ طلبار اور اساتذہ اس سے خاطرخواہ استفادہ نہیں کر پاتے تھے، اس لیے ۱۹۶۷ء سے ایک باقاعدہ لائبریرین کا تقرر کیا گیا تاکہ کتب خانہ مدرسے کے پورے اوقات میں کھلا رہے اور طلبار اور اساتذہ اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھا سکیں۔

تعلیمی مرکز قرول باغ میں کاغذ سازی، ابری گتہ اور باغبانی کا کام حرفے کے طور پر کرایا جاتا تھا۔ مدرسہ ابتدائی (اوکھلا) میں ان کے علاوہ تکلی کا کام بھی ہوتا تھا لیکن اس کے لئے الگ سے کوئی استاد نہ تھا۔ ۱۹۵۳ء سے مدرسے میں حرفے کے ایک استاد کا تقرر کیا گیا اور حرفے کا باقاعدہ نصاب بنایا گیا جس میں کاغذ گتہ اور لکڑی کا کام شامل ہے۔ جہاں تک باغبانی کے حرفے کا تعلق ہے شروع میں تمام جماعتیں باغبانی کا کام نہیں کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ہر جماعت کے لئے باغبانی کا حرفہ لازمی قرار دیا گیا، چوں کہ باغبانی کا آدھا منافع بچوں کو ملتا تھا اس لئے بچے شوق اور انہماک سے باغبانی میں کام کرتے۔ ۱۹۵۷ء میں ششم جماعت کے طلبار کو آلو اور ٹماٹر کی پیداوار سے ڈیڑھ سو روپے کا منافع ہوا۔ اس رقم کو طلبار نے مدرسے کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا جس سے محمد علی ہال کے لئے فریم بنوا کر ان میں چارٹ لگائے گئے اور دینیات کی تعلیم کو زیادہ موثر اور بہتر بنانے میں مدد لی گئی۔

دینیات کی تعلیم کا تعلق رسمی تعلیم سے کم اور طبیعت کے میلان سے زیادہ ہے، اس لئے ۱۹۴۸ء کے بعد محمد علی ہال میں جہاں اسلامیات کی کلاس ہوتی ہے چارٹس وغیرہ

آویزاں کر کے، بزرگانِ دین کی کہانیاں سنا کر، جلسے کر کے، ترانے میں طلبار سے قرآن اور حدیث کے منتخب ٹکڑے پڑھوا کر اور دیواری اخبار وغیرہ نکال کر دینی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ بچوں میں سچی دیانتداری پیدا ہو سکے۔ اس کے علاوہ جو نئے طریقے دوسرے مضامین کی تدریس میں استعمال ہوتے تھے انھیں اسلامیات کی تدریس میں بھی اپنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ بغیر کسی سختی کے بچے خود بخود شوق سے دینی معلومات کو ذہن نشین کرنے لگے اور دعائیں وغیرہ یاد ہونے لگیں۔

بچوں کی شخصیت کی صحیح نشو ونما اسی وقت ممکن ہے جب کہ ذہن کے ساتھ ساتھ جذبات کی بھی صحیح تربیت ہو، اس غرض سے مدرسے میں شروع ہی سے ایسے مشاغل کا انتظام کیا گیا جن کے ذریعہ بچوں کے اظہارِ خودی کے جذبے کی تسکین ہو سکے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد مدرسے میں ایسے مشاغل کا خاص اہتمام کیا گیا اور پہلی بار مختلف "ہوبیز" کی باقاعدہ تنظیم کی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں ہشتم کے طلبار نے ہوبیز کے سلسلے کی ایک نمائش کی جس میں ہوبیز سے متعلق بیس قسم کے مختلف کام پیش کئے گئے۔ اس نمائش کی خاص بات یہ تھی کہ طلبار کو بھی ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس قسم کی یہ پہلی نمائش تھی۔ لوگوں نے نمائش بہت پسند کی۔ آل انڈیا ریڈیو کے بچوں کے پروگرام میں بھی طلبار بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے اور ایسے اچھے پروگرام پیش کئے جو دوسرے اسکولوں کے لئے نمونے کا کام دیتے رہے۔ چوں کہ تعلیمی میلہ جامعہ کا ہر سال کا ایک مستقل پروگرام بن گیا تھا اس لئے بچوں کو اظہارِ خودی کا خوب موقع ملتا۔ اس موقع پر پیش کرنے کے لئے کسی ایسے ڈرامے یا پروگرام کا انتخاب کیا جاتا جس میں مدرسے کے زیادہ سے زیادہ بچے حصہ لے سکتے۔ ۱۹۵۶ء میں اسٹیج پر جو پروگرام پیش کیا گیا اس میں ایک ساتھ تقریباً ڈیڑھ سو طلبار نے حصہ لیا۔ میلے کے موقع پر مدرسے کی طرف سے جو ڈرامے یا پروگرام پیش کئے گئے ان کے حسن اور خوبی کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو چھوٹی عمر کے بچوں میں تعلیم کے کام کا تجربہ رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں جو عملی دشواریاں پیش آتی ہیں ان سے بخوبی واقف ہیں۔

مدرسے میں بچوں کی مجلس تو پہلے سے تھی ۱۹۵۲ء میں بچوں کی مجلس کو ختم کرکے بچوں کی حکومت قائم کی گئی تاکہ مدرسہ اور دارالاقامہ کی زندگی میں نظم کو قائم رکھنے میں طلبار اپنے اساتذہ کے برابر کے شریک ہوسکیں، صدر اور چیف جسٹس کے علاوہ ۹ وزیروں پر مشتمل بچوں کی حکومت کی ایک کابینہ ہے جو مدرسے میں ہر طرح کے نظم ونسق کی ذمّے دار ہے۔ عام انتخاب صرف صدر کا ہوتا ہے۔ بچوں کی حکومت کی مسند نشینی کا جلسہ بھی اپنی نوعیت کی خاص تقریب ہے جس میں صدر اور وزرار باقاعدہ جلوس کی شکل میں آتے ہیں اور حلفِ وفاداری اٹھاتے ہیں۔ پھر صدر اپنا خطبہ پڑھتا ہے۔ بچوں کی حکومت کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں سے اساتذہ بچوں کی حکومت کا لٹریچر منگواتے رہتے ہیں تاکہ اس کے نمونے پر اپنے مدرسے میں بھی حکومت قائم کرسکیں۔ مدرسے میں آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں ان کو بچوں کی کے عہدے دار ہی مدرسہ دکھاتے ہیں۔ اس طرح بچوں کو بڑوں سے بے جھجک ملنے اور بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ۱۴ر نومبر کو جب چاچا نہرو کی سالگرہ منائی جاتی اور اسٹیڈیم میں طلبار کا اجتماع ہوتا تو مدرسہ ابتدائی کا بچہّ ہی اس تقریب کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مشاغل کے ذریعہ تعلیم سے مدرسے کے بچّوں کی شخصیت پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ بچّوں کی حکومت کے زیرِ اہتمام سال میں ایک دن اسکول کا پورا انتظام بچّوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے تاکہ اس بات کی جانچ ہوسکے کہ بچّوں میں کس حد تک ذمّہ داری کا احساس پیدا ہوا ہے۔ مدرسے کے تمام استاد پکنک کے لئے کہیں چلے جاتے ہیں اور اس دن بچّے ہی استاد ہوتے ہیں اور بچّے ہی شاگرد۔ بچّوں کی حکومت کا صدر نگرانِ مدرسہ کے فرائض انجام دیتا ہے، باقی استادوں اور دوسرے کارکناں کا انتخاب بچّے آپس میں خود ہی کرتے ہیں۔ اس دن معمول کے مطابق پڑھائی کے علاوہ دارالاقامہ کی آرائش کا مقابلہ اور رات کے کیمپ فائر کا پروگرام خاص اہمیت رکھتے

ہیں ۔ بچے بہت شوق اور انہاک سے اپنی طبیعت اور اپج کے مطابق اپنے اپنے دارالاقامہ کی آرائش کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ رات میں کیمپ فائر کا پروگرام بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں تمام جماعتیں بڑی تیاری اور اہتمام سے حصہ لیتی ہیں ۔ یہ تجربہ ۱۹۴۸ء کے بعد شروع کیا گیا ۔ تجربہ بہت کامیاب ہے ۔

تعلیمی سیروں کا پروگرام مدرسے کے پروگرام میں شروع سے داخل رہا ۔ ۱۹۴۸ء کے بعد طلباء نے نہ صرف آگرہ تک بلکہ دارجلنگ، کلکتہ، مدراس، میسور، بنگلور اور بمبئی تک کی تعلیمی سیر کے پروگرام بنائے اور مدرسے میں جو سالانہ پکنک ہوتی تھی اس کی جگہ ہر جماعت کا باری باری سے دہلی کی تاریخی عمارتوں اور نمائشوں کی تعلیمی سیر کے لئے جانا مدرسے کے مستقل پروگرام میں داخل ہو گیا ۔

۱۹۴۸ء سے قبل مدرسے میں اسکاؤٹنگ کا انتظام تھا اور بڑی جماعتوں کے بچے فریدآباد کے قریب کیمپ کے لئے جایا کرتے تھے ۔ بعد میں کھلی ہوا کے مدرسے کے نام سے اس پروگرام کو ایک خاص شکل دی گئی ۔ مدرسہ ابتدائی کے کھلی ہوا کے مدرسے کو تعلیم کی نئی ٹیکنیک میں ایک نیا قدم کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا ۔ اس پروگرام کے لئے دہلی کے قرب وجوار میں ایسی جگہ تلاش کی جاتی، جہاں کا قدرتی ماحول اچھا ہوتا اور دو تین میل کے اردگرد اتنی کافی تعداد میں مختلف نوعیت کی چیزیں ہوتیں، جو ان دنوں کی تعلیم کے لیے نصاب کا مواد فراہم کرسکتیں ۔ کیمپنگ، اسکاؤٹنگ اور کیمپ فائر بھی پروگرام کا لازمی حصہ ہوتے ۔ دس دن کے لئے چار سو پانچ سو بچوں کا اس طرح خیموں میں زندگی گذارنا اور پروگرام کے مطابق تمام کام انجام پانا کوئی آسان بات نہیں ۔ مدرسے کا یہ منصوبہ بہت بڑا اور امتیازی منصوبہ ہے ۔ ان دس دنوں میں استاد اور طلباء کے مل جل کر ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے سے کام کی جو فضا پیدا ہوتی اور استاد اور طلباء جس محنت، شوق اور لگن سے کام کرتے اس کی مثال ہمارے ملک میں ذرا مشکل ہی سے ملے گی ۔ ہمارے ملک کے بچوں میں جان جوکھوں میں ڈالنے

کے جذبے کی بہت کمی ہے۔ کھلی ہوا کے مدرسے میں قدم قدم پر اس جذبے کو پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ دس دن کے بعد جب بچے واپس آتے تو واقعی اپنے کو زیادہ تندرست اور بہادر محسوس کرتے۔ حوض خاص، سورج کنڈ اور مہرولی میں کھلی ہوا کے مدرسے کے جو پروگرام ہوئے وہ بہت کامیاب رہے۔

۱۹۴۸ء سے پہلے جو ہر ٹرانی کے مقابلوں میں مضمون نویسی اور کہانی کے مقابلوں کے علاوہ کھیل کود اور کیمپنگ کے مقابلے بھی شامل تھے۔ بعد میں کچھ سالوں تک مقابلے نہ ہوسکے اس لئے کہ ٹرانی قرول باغ میں فسادات کی نذر ہو گئی تھی۔ کوشش کر کے ۱۹۵۲ء میں نئی ٹرانی بنوائی گئی اور دوبارہ مقابلے شروع کرائے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ٹرانی کے جو مقابلے ہوئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ دہلی کے بیس اسکولوں نے اس میں حصہ لیا تھا جہاں بچوں کے کیمپ تھے وہاں ایسا معلوم ہوتا جیسے بچوں کا ایک شہر آباد ہو گیا ہے۔ چند سال بعد مختلف انتظامی دشواریوں کے پیش نظر کیمپنگ اور کھیل کود کے آئیٹم مقابلے سے نکال دیئے گئے۔ البتہ اسٹیج کے آئیٹمس میں اضافہ کر دیا گیا۔ ان مقابلوں سے دہلی کے دوسرے اسکولوں کے اساتذہ اور طلباء سے قریب آنے کا بہت اچھا موقع ملتا رہا۔

۱۹۴۸ء سے قبل مدرسے میں کھیل اور اسپورٹس کے انتظام کے لئے استادوں ہی میں سے کوئی استاد ناظم کھیل کے فرائض انجام دیتا۔ ۱۹۵۴ء میں مدرسے میں باقاعدہ پی۔ ٹی۔ آئی کا تقرر عمل میں آیا۔ کھیلوں کا انتظام بہت عمدہ طریقے سے ہونے لگا۔ جمنیزیم کے میدان کو ٹھیک کیا گیا اور کئی نئے قسم کے جھولے وغیرہ لگوائے گئے۔ سالانہ اسپورٹس کے بعد تقسیم انعامات کے موقع پر جو سالانہ جلسہ ہوتا وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ جمنیزیم اور ہلکے پھلکے کھیلوں کے اچھے اچھے پروگرام پیش کئے جاتے، طلباء اور سرپرستوں کو اس پروگرام کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ اسپورٹس میں نہ صرف پوزیشن لانے والے بلکہ ہر اس طالب علم کو جو اسپورٹس میں حصہ لیتا انعام دیا جاتا اور اس بات پر زور دیا جاتا کہ مقابلے کا مقصد کسی دوسرے سے بازی لے جانا

نہیں ہے بلکہ خود اپنے سابقہ ریکارڈ کو توڑ کر نیا ریکارڈ قائم کرنا ہے اور اپنے آپ سے بازی لے جانا ہے۔

جہاں تک طلبار کے تربیتی پہلو کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ تعلیم کے میدان میں سیرت کی تعمیر کا کام سب سے زیادہ مشکل اور صبر آزما کام ہے اس کے لیے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے لفظی اور رسمی ہدایات اس راہ میں زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں، اس کا اصل انحصار اتالیق کے کردار اور اس کی سوجھ بوجھ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت جیسے اتالیق ہوتے ویسا ہی تربیت کا کام ہوتا اور معیار گھٹتا بڑھتا رہتا۔ انتظامی لحاظ سے اس سلسلے میں کئی تجربے کیے گئے، شروع میں ہر دارالاقامہ میں ایک استاد اتالیق کے ساتھ ایک کل وقت اتالیق رکھنے کا تجربہ کیا گیا، جو زیادہ کامیاب نہیں ہوا، اس کے بعد کالج کے اچھے طلبار سے مددگار اتالیق کی حیثیت سے کام لینے کی کوشش کی گئی۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ ہر دارالاقامہ میں دعوت افطار اور سالانہ دعوت کا خاص اہتمام ہونے لگا۔ دعوت کے ساتھ طلبار جلسہ کرتے اور کوئی ہلکا پھلکا پروگرام بھی پیش کرتے۔

غرض اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں مدرسے میں غیر معمولی تعلیمی کام ہوا اور خوب ہوا اور مدرسہ ابتدائی ایک نمونے کا کام کا مدرسہ (Activity School) بن گیا۔ مدرسہ میں جس نہج پر کام ہوا اور اس کے جو نتائج نکلے، استادوں نے جس اسپرٹ کا ثبوت دیا اور طلبار و اساتذہ میں محبت اور خلوص کا جو رشتہ پیدا ہوا، وہ اپنی مثال آپ ہے، اگر اسی طرح کا کام اور تجربے کسی باہر کے ترقی یافتہ ملک میں ہوتے تو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ استادوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی ہوتی اور جو کام اور تجربے مفید سمجھے جاتے ان کو دوسرے اسکولوں میں بھی رائج کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن افسوس یہاں یہ ریت نہیں۔

عبداللہ ولی بخش قادری

استادوں کا مدرسہ

موجودہ چوتھے پنج سالہ قومی منصوبے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیمی اداروں کو اُن کی پوری گنجائش کے مطابق وسعت دی جائے۔ ایک ترقی پذیر ملک کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ وسائل کا کماحقہٗ استعمال کیا جائے اور جو تعلیمی سہولتیں میسّر ہوں اُن سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔ یہاں صرف اثاثے اور مادّی ساز و سامان مثلاً عمارت، فرنیچر، کتب خانہ، تجربہ گاہ وغیرہ کی ہی بات نہیں ہے بلکہ ادارے کے انسانی وسائل مثلاً عملہ، اساتذہ وغیرہ سے زیادہ سے زیادہ طلبہ کو مستفید کرانے کا معاملہ بھی ہے۔ تب ہی یہ ممکن ہے کہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کی روز افزوں تشنگیٔ علم کو مناسب طور پر کسی قدر آسودہ کیا جاسکے۔ اِسی احساس کا اظہار تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے کے دوران، اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں "جامع تربیتی اداروں" (Comprehensive Training Colleges) کے تصوّر کی صورت میں کیا جاچکا ہے۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ایسے ادارے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جہاں مختلف منزلوں اور نوعیتوں کے اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جاسکے۔ مثلاً نہ صرف ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کے لیے اساتذہ تیار کیے جائیں بلکہ مخصوص مہارتوں اور فنون مثلاً آرٹ اور حرفے کے اساتذہ کو بھی درس و تدریس کے مسائل سے آشنا کیا جاسکے۔ ایسے اداروں میں تربیت کے تنوّع کے علاوہ، طلبہ کی تعداد بھی عام تربیتی مدارس کے مقابلے میں کئی گنا ہوسکتی ہے۔ ماہرینِ تعلیم کی جس کمیٹی نے اِس تصوّر کو پیش کیا، اُسے ہمارے مدرسے میں اپنے خواب کی ایک تعبیر نظر آئی اور نمونے

کے طور پر ہمارا نام لیا گیا۔ اس وقت ہمارے یہاں مندرجہ ذیل نصاب جاری ہیں:

۱۔ صداقت نامۂ معلمی (ڈپلوما آف بیسک ٹریننگ)

۲۔ جونیر ڈپلوما ان ٹیچنگ آف آرٹ اینڈ کرافٹ

۳۔ سندِ معلمی (بی۔ ایڈ)

۴۔ بی۔ ایڈ (آرٹ)

۵۔ ایم۔ ایڈ

۶۔ پی۔ ایچ ڈی (ایجوکیشن)

پہلے نصاب کے ذریعے ابتدائی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ دو سالہ نصاب ہے، اس نصاب میں اصول تعلیم، تعلیمی نفسیات اور تدریس کے طریقوں سے آگاہ کرنے کے علاوہ، موادِ تعلیم یعنی مدرسے کے درسی مضامین کی واقفیت پر بھی پوری توجہ دی جاتی ہے تاکہ طلبہ مضامین اور درسِ مضامین دونوں اعتبار سے کافی استعداد حاصل کر سکیں۔ 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کا دو سالہ 'ڈپلوما' حاصل کرنے کے بعد، طلبہ آٹھویں بلکہ دسویں جماعت تک 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کی تعلیم دینے کے لائق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ نصاب اپنی آپ مثال ہے۔ اس کے ذریعے 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کی نہ صرف مہارت بہم پہنچائی جاتی ہے بلکہ طلبہ کو اصولِ تعلیم، تعلیمی نفسیات اور تدریس کے طور طریقوں سے بھی آشنا کیا جاتا ہے۔ 'آرٹ' اور 'کرافٹ' کے اساتذہ کی تربیت میں ہمارے مدرسے نے اس ملک میں پیش قدمی کی ہے۔ اس کے بعد "ریجنل کالج آف ایجوکیشن" کے نام سے ملک میں چار ادارے قائم کیے گئے۔ ہماری ان کوششوں نے نہ صرف 'آرٹ' کے اساتذہ کا مقام بلند کیا ہے بلکہ دیس کے تعلیمی حلقوں میں اُن کی تربیت کی طرف کچھ نہ کچھ توجہ بھی دلائی ہے۔ سندِ معلمی کے نصاب کی مدت ایک سال ہے جو ثانوی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کرتا ہے۔ بی۔ ایڈ (آرٹ) کا نصاب، سندِ معلمی کے نصاب کے مساوی، "آرٹ" کے اساتذہ تیار کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ یہ نصاب

بھی ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے جو ثانوی مدارس میں 'آرٹ' کی تعلیم اور 'آرٹ' کے اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں ایک اہم اور جرأت مندانہ قدم کہلانے کا مستحق ہے ۔ ایم۔ایڈ کے نصاب کو ایک سال کی مدت میں بھی پورا کیا جاسکتا ہے اور جز وقتی نصاب کے طور پر اس کی تکمیل دو سال میں بھی ہوتی ہے ۔ اس نصاب کی تشکیل میں نہ صرف جدید تعلیمی میلانات کا خیال رکھا گیا ہے بلکہ 'آرٹ' اور 'کرافٹ' سے متعلق مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی طرف اس اعلیٰ تعلیمی سطح پر ابھی تک ملک کے کسی اور ادارے میں توجہ نہیں دی گئی ہے ۔ اگرچہ باضابطہ طور پر پی۔ایچ ڈی کی ڈگری امسال شروع کی گئی ہے لیکن تعلیمی تحقیق کا کام ایک عرصے سے جاری ہے اور مدرسے میں وقتاً فوقتاً تحقیقی کام کرنے کے لئے طلبہ کو داخل کیا جاتا رہا ہے ۔

جامعہ کے جشن زریں کے موقع پر اِس مدرسے کی عمر ۳۲ سال ہوتی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ ادارہ ، جامعہ کی تاسیسی عمر سے ۱۸ سال چھوٹا ہے ۔ لیکن اِس کا آغاز اِن محرکات کی دین ہے جو جامعہ کے وجود کا باعث ہیں اور اس کی توسیع و ترقی میں وہی جذبہ اور حوصلہ کارفرما رہا ہے جو جامعہ کا سرمایۂ حیات ہے ۔ جامعہ ، ملک کی آزادی کی تحریک کا ایک حصہ ہے ۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے ۔ رہنمایانِ قوم میں گاندھی جی ، علی برادران ، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے نام سرِفہرست آتے ہیں جنھوں نے جامعہ کا پودا علی گڑھ میں لگایا ۔ اس کی آبیاری کرنے والے نوجوان سرفروشوں کے رہنما ڈاکٹر ذاکر حسین تھے ۔ ہمارا "استادوں کا مدرسہ" ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا ۔ قومی تعلیم کی تاریخ میں یہ زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء میں دیس کے سامنے 'بنیادی قومی تعلیم' کا تصور پیش کیا اور 'ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی' نے اُن کے اِس تصور کو تعلیمی اسکیم بنا دیا ۔ دیس کے اُن صوبوں میں 'بنیادی قومی تعلیم' شروع ہو رہی تھی جہاں کانگریس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آگئی تھی ، بنیادی مدرسوں کے لیے اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا ، اس فوری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے دو جگہ انتظام ہوا ۔ گاندھی جی کے سیوا گرام میں اور ذاکر صاحب کی جامعہ میں ۔ اس طرح ۱۹۳۸ء میں اس مدرسے کو گاندھی جی کی نیک خواہشات اور

ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی مالی امداد سے شروع کیا گیا۔

آغازِ کار کے وقت بے سروسامانی کا عالم تھا۔ نہ عمارت تھی، نہ کتابیں نہ دیگر وسائل اور نہ اساتذہ۔ لیکن شوق کی بلندی نے کسی بات کی پروا نہ کی نجی عمارت میں کام شروع ہوا۔ جامعہ کے تجربہ کار معلمین نے اساتذہ کی نئی نسل تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کی اور ذاکر صاحب نے اپنے وجود سے علمی قیادت کا دیا روشن کیا۔ وہ جرمن تعلیمی مفکر کرشنسٹائنر (Kerschensteiner) کے تعلیمی خیالات سے خاص طور پر متاثر تھے۔ مغربی ممالک میں 'ترقی پسند تعلیم' (Progressive Education) کی تحریک کا علم رکھتے تھے اور بنیادی تعلیم کے آیین مُعین کہلانے کا پورا حق بھی اُن ہی کو پہنچتا تھا۔ اُن کے زیرِ اثر جامعہ کے اس مدرسے میں حرفے کی تعلیم کا ایک ایسا تصور پروان چڑھا جو بنیادی تعلیم کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں حرفے کی تعلیمی حیثیت کو پورے طور پر اُبھارنے کی کوشش کی گئی۔ اسے اساتذہ کی تربیت کا لازمی جزو قرار دیا گیا اور شخصیت کی تعمیر میں اس کی اہمیت پورے طور پر تسلیم کی گئی لیکن اس کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی عقیدت اور تجارتی منفعت کی آمیزش کو روا نہیں رکھا گیا۔ ذاکر صاحب شروع سے ہی ہاتھ کے کام کی عظمت کے معترف تھے اور جامعہ کے ابتدائی مدرسے میں چھوٹے چھوٹے مشاغل کی شکل میں بچوں کو کام کے ذریعے سیکھنے کے مواقع فراہم کیے جاتے رہے تھے۔ 'استادوں کا مدرسہ' آج بھی اپنی اِس خصوصیت کو برقرار رکھتا ہے۔ یہاں ابتدائی مدرسے اور ثانوی مدرسے کے لیے اساتذہ کی تیاری میں حرفے کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایم۔ ایڈ کے نصاب میں بھی حرفے سے متعلق مضامین کی تعلیم کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔

شروع شروع میں "استادوں کا مدرسہ" میں صرف ایک ہی نصاب کا انتظام تھا۔ ۱۹۵۲ء میں ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کے لیے الگ الگ نصاب جاری کیے گئے۔ ملک کی مختلف ریاستوں نے اپنے اساتذہ کو تربیت کے لیے یہاں بھیجا اور یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ نے اپنی اپنی ریاستوں میں بنیادی تعلیم کے اساتذہ کے مرکز قائم کرنے میں ہراول دستے کا کام

انجام دیا۔ اس طور چراغ سے چراغ روشن ہوتے رہے اور دیس کے مختلف حصوں میں بنیادی تعلیم کا کام مستحکم ہوگیا۔ اب ریاستوں کو ایسی رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے ۔ لیکن اساتذہ کی تیاری میں اِس مدرسے کو قومی ذمہ داری کی ادائیگی میں شرفِ قبولیت بدستور حاصل ہے ۔ اب بھی امیدواروں کی تعداد ہر سال اتنی زائد ہوتی ہے کہ اوسطاً دس میں سے ایک کو داخلہ مل پاتا ہے ۔

اس مدرسے میں شروع سے ہی مروجہ طریقہ امتحان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا اور تعلیمی مقاصد کے حصول میں اسے رکاوٹ خیال کیا گیا۔ ایک سالانہ امتحان کے بجائے دوران سال میں طلبہ کی کارگزاری پر زور دیا گیا اور انھیں لگن کے ساتھ پوری مدت اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہنے کی راہ دکھائی گئی۔ اب طریقہ امتحان میں اصلاح کا کام قومی پیمانے پر کیا جارہا ہے ۔ استادوں کا مدرسہ اس باب میں اپنی مساعی پر اظہار اطمینان کرسکتا ہے کہ تعلیمی جائزے کے تصور کو ملک میں اپنایا جارہا ہے ۔ اِس وقت نظری مضامین میں دورانِ سال کی کارگزاری، جانچ اور تفویض کا حصّہ، سالانہ امتحان کے برابر ہے۔ اس منزل پر ابھی شاذ ہی ہمارے دیس کے ادارے آپائے ہیں۔ عملی مضامین میں سالانہ امتحان کو یک سر موقوف ہی کردیا گیا ہے ۔ تعلیمی، تہذیبی اور تفریحی سب ہی مشاغل میں طلبہ کی کارگزاری کو ان کے تعلیمی جائزے کا لازمی جزو قرار دے دیا گیا ہے ۔

استادوں کا مدرسہ، اردو کے ذریعہ تعلیم دینے والے اساتذہ کی تربیت کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرتا ہے ،، ایسے طلبہ کے لیے نشستوں کا تحفظ کیا گیا ہے ۔ مزید برآں اردو کی تدریس کا باضابطہ انتظام ہے اور غیر اردو داں طلبہ کو ابتدائی اردو سکھانے کا بندوبست کیا جاتا ہے ۔ طلبہ، امتحانات میں اپنے جوابات اردو میں لکھ سکتے ہیں، لیکن یہ ادارہ زبان کے استبداد سے پاک ہے، مادری زبان کا فرق طلبہ کی کسی تفریق کا باعث نہیں ہے ۔ یہاں بلا امتیاز زبان و مذہب طلبہ آتے ہیں، اساتذہ کا بھی یہی حال ہے ۔ روز بروز طالبات کی تعداد

بڑھتی جارہی ہے۔ آج کل ان کا حصہ نصف سے زائد ہے۔ طلبہ کے لیے اقامتی زندگی لازمی ہے۔ طالبات کے لیے اگرچہ اقامت گاہ کا انتظام ہے لیکن انھیں اپنے گھر پر رہنے کی سہولت بھی حاصل ہے۔ اس وقت مدرسے کے مختلف نصابوں میں طلبہ کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ یہ مدرسہ ایک "جامع تربیتی ادارے" کا ایک مختصر نمونہ پیش کرتا ہے۔ فی الحال طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے اس کا دامن وسیع نہیں ہے، لیکن اسے کسی وقت بھی خاطر خواہ طور پر پھیلایا جاسکتا ہے۔ تعداد کے اضافے کے علاوہ، نئے نئے نصاب تعلیم بآسانی جاری کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً تین برس سے چھ برس تک کے بچوں کی تربیت کرنے والی استانیوں کی تیاری یا جسمانی تعلیم کے اساتذہ کی تربیت۔ قومی نظام تعلیم میں جس وقت "جامع تربیتی ادارے" قائم کرنے کے لئے قدم بڑھایا جائے گا، ہمارے اس چھوٹے سے تجربے اور نمونے سے مثال کا کام بخوبی لیا جاسکے گا اور جب بھی ملک کی ضروریات متقاضی ہوں گی، بلادقت اور بلا زحمت اس نمونے کو پورے پیمانے پر پہنچایا جاسکے گا۔

بالک ماتا سنٹر

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نے ۱۹۵۲ء میں ٹٹیا محل دہلی کے علاقے میں غریب اور متوسط طبقے کے بچوں کے لیے ایک نئی اسکیم کے تحت بالک ماتا سنٹر کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد صرف بچوں کے لیے نرسری اسکول قائم کرنا ہی نہ تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ اس تصور کو بچوں کے گھروں تک بھی پہنچایا جائے اور بچوں کے وسیلے سے ان کی ماؤں کی بھی تربیت کی جائے۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ دلی کے مختلف علاقوں میں اور سنٹر قائم ہوئے اور اس وقت تین سنٹر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

ہمارا طریق کار اس لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہے کہ ہم اپنی نرسریوں میں اتنا قیمتی ساز و سامان نہیں رکھتے جو اس طبقے کی معاشی حالت کے مطابق نہیں ہے، تاکہ بچہ نرسری میں آکر اجنبیت محسوس نہ کرے۔ ہمارا مقصد دراصل یہ ہے کہ غریب اور متوسط گھرانوں میں ان ذرائع کا بہتر استعمال سکھایا جائے جو ان کے پاس اس وقت موجود ہیں۔ ان نرسریوں کی استانیاں اکثر ان بچوں کے گھروں پر جاتی ہیں اور ان کے حالات اور خاندان کے مختلف ممبروں کے باہمی تعلقات سے واقفیت حاصل کرتی ہیں اور ان کی ماؤں اور بڑی بہنوں کو خصوصیت کے ساتھ سنٹر آنے کی دعوت دیتی ہیں اور بچوں کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں، انھیں بتاتی ہیں کہ ان کے بچوں کی مخصوص عادتوں کے اسباب کیا ہیں اور کس طرح وہ اپنے بچوں کی بہتر طور پر دیکھ بھال کریں۔ عام طور پر غریب اور متوسط طبقے کی ماؤں کے لئے اس قسم کے مشوروں کی بہت ضرورت ہوتی ہے، خصوصاً غذا، حفظانِ صحت اور جذباتی معاملات میں اس قسم کی مدد اور مشورے اور زیادہ ضروری ہیں۔

مشیر فاطمہ

نرسری اسکول

جامعہ کے قیام کے پورے ۲۵ سال بعد جامعہ میں نرسری اسکول کھلا۔ ذاکر صاحب جہاں جرمنی کی پرائمری ایجوکیشن (ابتدائی تعلیم) سے بہت متاثر تھے وہاں وہ جرمن کنڈر گارٹن کے بھی بڑے مداح تھے۔ مس گرڈا فلپسبورن (جرمن آپا جان) نے یہ کام شروع کر دیا تھا۔ اول جماعت کی تعلیم و تربیت کے لئے وہ فروبل اور مونٹوسری کا سامان استعمال کرتی تھیں۔ جشن سیمیں کے موقعہ پر کنڈر گارٹن کے قیام اور اس کی عمارت کی بھی تجویز تھی۔ لیکن سیاسی حالات کے نشیب و فراز کی وجہ سے اس منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

۱۹۵۲ء میں جب میں ڈپلوما کرنے کے لیے لندن جا رہی تھی تو پروفیسر محمد مجیب صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ لندن کے کنڈر گارٹن اور ان کی اقامت گاہوں کا اچھی طرح سے مطالعہ کرنا تاکہ جامعہ میں اس کام کو شروع کیا جا سکے۔

میں نے دسمبر ۴۵ء میں مونٹوسری کی آل انڈیا کانفرنس میں شرکت کی تھی اور مارچ سے جولائی ۴۶ء میں میڈم مونٹوسری کی قیادت میں ٹیچرز ٹریننگ حاصل کی۔ اس وجہ سے مجھے چھوٹے بچوں کی تعلیم سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس ٹریننگ سے جب واپس آئی تو مجھے مجیب صاحب سے پہلی بار ملنے کا موقعہ ملا۔ موصوف نے میڈم مونٹوسری اور ان کے طریقۂ تعلیم سے متعلق کئی دلچسپ سوالات کئے۔ مجیب صاحب ان پر اعتراض کرتے اور میں اپنی محبوب استاد کی حمایت کرتی۔ اس وقت میں جامعہ میں کام نہیں کرتی تھی لیکن جامعہ میں کام کرنے کے لئے یہ میرا پہلا

اور آخری انٹرویو تھا۔

اس زمانے میں بنیادی تعلیم کے حامی میڈم مونٹیسری پر بہت اعتراض کر رہے تھے اور میڈم مونٹیسری اور ان کے حامیوں کی خواہش تھی کہ آزاد ہندوستان میں بنیادی تعلیم کے ساتھ ابتدائی سے پہلے کی تعلیم میں مونٹیسری طریقۂ تعلیم رائج کیا جائے۔ لیکن ذاکر صاحب چونکہ Progressive education کے قائل تھے اس لئے مونٹیسری طریقۂ تعلیم کی rigidity کو پسند نہیں کرتے تھے۔

لندن میں ڈپلوما کرنے کے بعد میں نے دو مہینے تک وہاں کے نرسری اسکولوں کا اس طرح مشاہدہ کیا کہ ایک یا دو ہفتے کے لئے کسی نرسری اسکول میں مددگار کی حیثیت سے کام کرتی۔ اس طرح مجھے اسکول کے طریقۂ تعلیم، پروگرام اور تعلیمی سامان سے متعلق معلومات ہو گئیں۔

۱۹۵۵ء میں مجلس تعلیمی نے نرسری اسکول کھولنے کی منظوری دے دی۔ عمارت کے لئے ایک دو کمروں کا مکان اور اس کے سامنے کی بیلچے کی کیاریاں دی گئیں۔ اسٹاف میں ایک نگران، ایک استانی، ایک چپراسی ایک جز وقتی مہتر۔ اور تعلیمی سامان کے لئے پانچ سو روپے منظور ہوئے۔ عمارت کو ٹھیک کرانے اور اس کے ساتھ لان وغیرہ بنوانے کی ذمہ داری شعبہ تعمیرات کی تھی۔

اس طرح ۱۶ر اگست ۵۵ء کو نرسری اسکول میں داخلے شروع ہو گئے۔ آصفہ خاتون کا دوسری استانی کی حیثیت سے تقرر ہو گیا اور چپراسی باغبانی کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ اس وقت اسکول کی حالت کو دیکھ کر شاید کوئی یہ نہ کہتا کہ پندرہ سال بعد جامعہ نرسری اسکول کا دہلی کے بہترین اسکولوں میں شمار ہوگا اور دہلی اور باہر کے اکثر اسکول اس کے طریقۂ تعلیم اور تعلیمی سامان کو اپنانے کی کوشش کریں گے۔ سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ نے ملک کی پائلٹ (Pilot) بال واڑی کے لئے نرسری اسکول کے تعلیمی سامان کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، اس کامیابی کے لئے نرسری اسکول کے کارکنان سے زیادہ ہمارے شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب

مبارکباد کے مستحق ہیں۔ موصوف نے ہم کو کام کرنے کی آزادی دی تھی اور کام کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن مدد کی۔

جامعہ زسری اسکول کا مقصد بچے کی جسمانی، ذہنی، سماجی اور جذباتی نشوونما میں مدد کرنا اور ابتدائی مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم کے لئے تیار کرنا ہے۔ جامعہ میں کام کرنے والوں کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنا طریقہ کار خود متعین کریں۔ جامعہ کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں روایتی طریقۂ تعلیم کے بجائے ترقی پسند طریقۂ تعلیم کو رائج کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسی لئے زسری اسکول میں مونٹوسری یا فروبل کے طریقۂ تعلیم کو رائج کرنے کے بجائے بچے کی ضرورتوں اور کھیلوں پر مبنی طریقۂ تعلیم کو رائج کیا گیا۔ بچے کی کیا ضروریات ہیں؟ بچے کو گھر کے محفوظ ماحول سے نکل کر اسکول کے آزاد ماحول میں داخل ہونا ہے، اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، اپنی ضروریات آپ پوری کرنی ہیں۔ تین سال کا بچہ جسے ابھی دوڑنا بھاگنا نہیں آتا، اپنی ضروریات کا اندازہ نہیں کر سکتا، جو اپنی بات پوری طرح سے کہہ نہیں سکتا دوسروں کی بات سمجھ نہیں سکتا، اس بچے کو زسری اسکول کے تین سال میں اس قابل ہونا ہے کہ وہ اکیلے اسکول آ جائے۔ دوسروں کی بات سمجھ سکے، اپنی بات کہہ سکے، جو زبان وہ ابھی بولنا نہیں جانتا اسے لکھ پڑھ سکے، گنتی گن سکے، حساب لگا سکے۔

اس عمر میں بچے کی جسمانی نشوونما میں مدد کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ بچے کے بڑھتے ہوئے جسم کے لئے کھلی اور آزاد فضا کی ضرورت ہے جہاں وہ بھاگ دوڑ سکے، اتر چڑھ سکے، کود پھاند سکے۔ اسکول میں سائیکل اور گاڑیاں چلانے کے لئے پکا فرش ہے، چڑھنے اترنے اور پھسلنے کے لئے درختوں کے سائے میں سلائیڈ اور ریت ہے، بڑے لان میں جھولے، جنگل جم، مختلف قسم کے پائپ کے فریم ہیں جن پر بچے چڑھتے ہیں، کرتب دکھاتے ہیں اور کودتے پھاندتے ہیں، اس طرح ان کو اپنے ہاتھ پیر استعمال کرنے اور ان پر قابو پانے کا موقع ملتا ہے۔

مختلف قسم اور سائز کے لکڑی کے بلاکس ہیں جن سے بچے طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔ تین سال

کا بچہ دو تین بلاکس ایک دوسرے پر رکھ لیتا ہے۔ کوئی قطب مینار بناتا ہے، کوئی انڈیا گیٹ، مکان کے کمرے، غسل خانے، پاخانے اور چبوترے بنتے ہیں۔ چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں بنتی ہیں۔ بلاکس کو رکھنے اور اٹھانے میں اپنی انگلیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ سیڑھیاں بنانے کے لئے ایک سے دس تک گنتی گنتے ہیں۔ گیٹ بنانے کے لئے دو اور دو چار گٹوں کی ضرورت ہے۔ سڑک بناتے ہیں جو اوکھلے سے فوارے جاتی ہے۔ راستے میں اوکھلا موڑ، ریل کا پل، دہلی گیٹ اور فوارے کے بس اسٹاپ ہیں۔ سڑک کے کنارے ہولی فیملی، جامع مسجد اور لال قلعہ ہے، چوراہے پر پولیس ہے، ٹریفک لائٹ ہے، لال لائٹ پر سب سواریاں رک جاتی ہیں۔

گڑیا کے کمرے میں گھر کے سامان کی مختلف چیزیں ہیں۔ اماں کا پلنگ ہے، بچے کا جھولا ہے، سنگار میز ہے، ابا کے پڑھنے کی میز کرسی ہے، باورچی خانے کی الماری ہے، کھانا پکانے کے برتن ہیں، چائے کا سیٹ ہے، گھر گھر کھیل ہوتا ہے، اماں کھانا پکاتی ہیں، ابا سامان لاتے ہیں، چھوٹا بھیا روتا ہے تو بڑی بہن اُسے کھلاتی ہے، عید کی تیاری ہوتی ہے، گھر صاف کیا جاتا ہے، سب کے نئے نئے کپڑے بنتے ہیں، لوگ ملنے آتے ہیں تو ان کو مٹھائی کھلائی جاتی ہے۔ کبھی گڑیا گڈے کی شادی ہوتی ہے، چھیم چھیم بارات آتی ہے، لڑکیاں سہرا گاتی ہیں، لڑکے باجا بجاتے ہیں۔ کبھی گڑیا بیمار ہو جاتی ہے تو ڈاکٹر آلہ لگا کر آتا ہے، نرس انجکشن لگاتی ہے، اماں دوا پلاتی ہیں۔ یہ سب بچوں کے بے معنی کھیل نہیں ہیں، بچہ تو اسی سے سیکھتا ہے، اپنے ماحول کو سمجھتا ہے، اپنے جذبات پر قابو پاتا ہے، وہ آپس میں بات چیت کر کے نئے الفاظ سیکھتے ہیں، ان کے معنی سمجھتے ہیں اور ان کو موقعہ سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی ذخیرۂ الفاظ سے وہ اپنی اول جماعت کی کتاب کو سمجھ کر پڑھ سکیں گے اپنی بات ساتھیوں اور استاد کو سمجھا سکیں گے۔

بچوں کو آرٹ اور کرافٹ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے وہ ہفتے کے ہر روز نئی چیز بناتے ہیں، پنسل سے ڈرائنگ بناتے ہیں، برش اور انگلیوں سے پینٹنگ کرتے ہیں، لکڑی کے چھاپے سے چھاپتے ہیں، رنگ برنگ کے کاغذ کے ٹکڑوں، اسپنج کے پھولوں، ٹین کے

ستاروں، اون اور لچکے کے بیکار ٹکڑوں سے طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔

کہانیاں سنتے ہیں، گانا گاتے ہیں۔ لہنگے، دوپٹے، کوٹ اور ٹوپیاں پہن کر ان کہانیوں اور گانوں کے ڈرامے کرتے ہیں۔ بچوں کے کھیل ان کی زندگی ہے۔ دنیا اور ما فیہا سے بے خبر اپنے آپ میں مست روز نئے نئے کھیل کھیلتے ہیں۔ ان کو کھیل کی آزادی ملنا ان کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ ان کے شوق کے مطابق ان کو کھیل کا موقعہ فراہم کرنا نرسری اسکول کا فرض ہے۔ یہ بے فکری کا زمانہ پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ہم ان کو گنتی کے چکر اور اور کتابوں کے بوجھ سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

پستالوزی نے کہا تھا کہ آپ کا بچہ سیپ کا موتی ہے، موتی بننے کے بعد وہ خود باہر آجائے گا۔ آپ اس کے موتی بننے کا انتظار کیجئے۔

شعبۂ انجینرنگ

۱۹۵۶ء میں حکومت ہند نے ملک کے مختلف حصوں میں ۱۴ رورل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے، ان میں سے ایک جامعہ ملیہ کے حصے میں آیا۔ اس میں دو قسم کے نصاب جاری کئے گئے، ایک سول اینڈ رورل انجینرنگ کا سہ سالہ نصاب اور دوسرا رورل سروسز کا سہ سالہ نصاب۔ ان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جو ڈپلوما دیا جاتا ہے، ان کی حیثیت وہی ہے، جو مختلف اسٹیٹ بورڈ کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ انجینرنگ کے نصاب میں رورل کے جزو کو برقرار رکھا گیا ہے اور چند مخصوص مضامین کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، جو ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر اہم اور ضروری ہیں۔

شعبۂ انجینرنگ کا صرف انتظام جامعہ ملیہ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے دوسرے رورل انسٹی ٹیوٹ کی طرح، مالی اور تعلیمی نگرانی آل انڈیا نیشنل کونسل فار رورل ہائر ایجوکیشن (وزارت تعلیمات) کے سپرد تھی، مگر یہ شعبہ مکمل طور پر جامعہ ملیہ سے ملا دیا گیا ہے اور اب جامعہ کا باقاعدہ شعبہ ہے، البتہ چونکہ اس کی تعلیم ٹکنیکل ہے، اس لیے بورڈ آف ٹکنیکل ایجوکیشن (دہلی) سے الحاق کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس صورت میں توقع ہے کہ اس شعبہ میں مزید توسیع ہوسکے گی اور بعض دوسرے ٹکنیکل نصاب جاری کئے جاسکیں گے۔

اسکول آف سوشل ورک

رورل انسٹی ٹیوٹ کے دوسرے شعبے، رورل سروسز کا ڈپلوما کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ شروع میں خیال تھا کہ ملک میں دیہی ڈیولپمنٹ کے جو کام ہو رہے ہیں، اس کے فارغ التحصیل طلبار اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے اور جو لوگ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہیں، ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی پیش نہیں آئے گی، مگر بیشتر یونیورسٹیوں نے اس کے ڈپلوما کو تسلیم نہیں کیا اور کمیونیٹی ڈیولپمنٹ منسٹری نے ملازمتیں نہیں دیں، اس لیے جب رورل انسٹی ٹیوٹ کا وزارت تعلیمات سے تعلق باقی نہیں رہا اور وہ کلی طور پر جامعہ کے ہاتھ میں آگیا تو ۱۹۶۷ء میں شعبۂ رورل سروسز کا نام بدل کر جامعہ اسکول آف سوشل ورک کر دیا گیا۔ اس میں سہ سالہ کورس جاری کیا گیا ہے اور سوشل ورک میں بی اے آنرز کی ڈگری دی جاتی ہے۔

اس ادارہ میں انڈر گریجویٹ طالب علموں کے لیے سماجی علوم کی بنیادی معلومات اور سوشل ورک کی نظری تعلیم کے علاوہ اس کے مواقع بھی فراہم کئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے نظریاتی علم کو سماجی تعلقات کے میدان میں عملی طور پر آزما سکیں۔ اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ فارغ التحصیل طلبار کے لیے ترقی کے زیادہ سے زیادہ دروازے کھلے رہیں، ایک طرف ان کے سوشل ویلفیر کے اداروں میں ملازمت کے امکانات ہیں تو دوسری طرف وہ سوشل ویلفیر میں ایم اے بھی کر سکیں گے، اس کے علاوہ وہ سوشل سائنس کے کسی مضمون میں بھی ایم اے کرنے کے مستحق ہوں گے۔

سوشل ورک میں ایم اے کا نصاب تعلیم ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں میں رائج ہے،

مگر بی اے کی سطح پر ابھی تک سوشل ورک کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام نہیں ہے، جس کی وجہ سے سوشل ورک کے میدان میں درمیانی درجے کی آسامیوں کے لیے سند یافتہ کارکن نہیں ملتے۔ جامعہ کے اس ادارے سے ملک کی یہ ضرورت پوری ہو سکے گی۔

سماجی فلاح و بہبود کے کام اسی وقت صحیح طور پر انجام پا سکتے ہیں، جب صاحب صلاحیت نوجوان اس کام کی طرف متوجہ ہوں اور اس فن میں تربیت حاصل کریں۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ہونہار طالب علموں کو شریک کرنے کے لیے ایک اسکیم تیار کی گئی ہے، اس اسکیم کے تحت محدود تعداد میں وظیفے دیے جا سکتے ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہونہار ضرورت مند طلبار کو اس سے بڑا سہارا ملا ہے اور اس طرح ادارے میں ذہین طلبار کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

امیر جامعہ

۱۔ پہلے امیر جامعہ ـــــ حکیم اجمل خاں ۱۹۲۰ـــ۱۹۲۷

۲۔ دوسرے امیر جامعہ ـــــ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۹۲۸ـــ۱۹۳۶

۳۔ تیسرے امیر جامعہ ـــــ عبدالمجید خواجہ ۱۹۳۷ـــ۱۹۶۲

۴۔ چوتھے امیر جامعہ ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۶۳ـــ۱۹۶۹

۵۔ پانچویں امیر جامعہ ـــــ چیف جسٹس محمد ہدایت اللہ ۱۹۶۹۔
(یہ دور ابھی جاری ہے)۔

پہلے امیر جامعہ — حکیم اجمل خاں

۱۹۲۰ — ۱۹۲۷ء

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

پہلے امیر جامعہ ــــــ حکیم اجمل خاں

۱۹۲۰ء ــــــ ۱۹۲۷ء

گیارہ سال سے اوپر ہوتے ہیں[1]، علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا اور ہندوستانی تعلیم گاہوں میں طلبہ کی جو تقسیم "کھیلنے والوں" اور "پڑھنے والوں" میں کی گئی ہے، اس کے مطابق "پڑھنے والوں" میں تھا۔ صحت ظاہر ہے ہمیشہ خراب رہتی تھی۔ طب جدید کی توجہات جب کچھ مدد نہ کرسکیں تو خیال ہوا کہ یونانی علاج کرایا جائے اور یونانی علاج کے لیے اس کے سوا اور کوئی کیا مشورہ دیتا کہ اس فن کے امام بلکہ اس کے مسیحا کے پاس جاکر درماں طلبی کی جائے۔ حکیم صاحب (اس حکیم ملت کے لیے بس یہی لقب کافی تھا) کے پاس جانے کا ارادہ تو کرلیا، لیکن بتایا گیا کہ بے سفارش نہ جانا، بڑا دربار ہے، توجہ نہ ہوگی۔ تیاری میں کئی ہفتے گذر گئے، بالآخر میرے مخدوم بشیرالدین صاحب کو معلوم ہوا تو وہ خود اپنے ہمراہ مجھے دہلی لائے، مطب میں پہنچے، مریضوں کا ہجوم تھا، ۱۱-۱۲ بجے تک مطب ہوتا رہا، جب اٹھے تو مولوی بشیرالدین صاحب سے ملاقات ہوئی، انھیں سہ پہر کو چائے پر بلایا، میں بھی پہنچ گیا، لیکن کچھ اور لوگ بھی تھے، نبض دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے روز مطب میں بلایا، پھر وہی اژدہام تھا، کوئی ۱۱ بجے نوبت آئی، نسخہ مل گیا اور میں علی گڑھ واپس آگیا۔ سفارش کے باوجود دو روز تک انتظار

---

[1] حکیم صاحب کے انتقال پر ۱۹۲۷ء میں یہ مضمون لکھا گیا۔ (اعظمی)

کرنے سے طبیعت بالکل مکدر نہ ہوئی، بلکہ مریضوں کی کثرت، ہر کونے ہر گوشے میں درماں جویاں کا ہجوم، مکان کے دروازے تک موٹر میں بیٹھنے کے بعد تک نبض دکھانے والوں کا ہاتھ بڑھا دینا، یہ سب باتیں دیکھکر اس بڑے آدمی کی بڑائی دل میں اور بڑھتی تھی، لیکن یہی عظمت کہ بڑا دربار ہے، بڑوں ہی کا یہاں گذر ہے، بلا وسیلہ وسفارش حکیم صاحب سے علاج کرانا مشکل ہے۔

لیکن گیارہ سال بعد جب جامعہ کے کاموں کی وجہ سے میں تقریباً اپنا تمام وقت جو جامعہ سے بچتا تھا، اسی دربار میں گذارنے لگا تو معلوم ہوا کہ یہ خیال ٹھیک نہ تھا، سفارش والے یہاں سب پیچھے رہتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ تنگ وتاریک گلیوں میں میں ساتھ گیا ہوں، کسی ٹوٹے مکان کے دروازے پر کھڑا رہا ہوں اور دنیا کا یہ سب سے بڑا طبیب، نوابوں کا نواب کسی بڑھیا کو دیکھنے اندر گیا ہے، جس کی عسرت کا یہ حال ہے کہ مجھ ہمراہی کے لیے بیٹھنے کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تھی، جب گھر سے نکلتے تو مسکراتے ہوئے کہتے کہ آپ کو بہت دیر ٹھہرنا پڑا۔

۱۲ر دسمبر کی شب میں جب تین چار روز تک درد کی وجہ سے بستر پر لیٹے لیٹے مشکل سے اٹھ کر بیٹھے اور دوسرے روز صبح باوجود اس تکلیف کے بمبئی کے سفر کا قصد تھا تاکہ شاہ افغانستان کی خدمت میں جامعہ کا ایڈریس پیش کر سکیں تو میں بھی پاس بیٹھا تھا۔ رات ہو چکی تھی، لیکن مریض آ آکر نسخے لے رہے تھے، جب سب جا چکے تو اپنے ایک شاگرد کو بلا کر فرمایا کہ کل کچھ لوگ نبض دکھانے آئے تھے اور آج صبح بھی انتظار کرتے رہے، میں نہ دیکھ سکا، بیچارے غریب لوگ ہیں، وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ بمبئی کی طرف سے آئے ہوں گے، ذرا جا کر قریب کے ہوٹلوں میں تلاش کرو اور مل جائیں تو لے آؤ اور ان کے لیے بھی نسخہ تجویز کر دوں۔ یہ اور اس قسم کے سیکڑوں واقعات اس وقت میرے ذہن میں ہیں، جو صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ نواب، غریبوں، لاوارثوں، بے وسیلوں کا عاشق تھا اور یہ خیال بالکل غلط تھا کہ اس کے دربار میں بے وسیلہ رسائی نہیں۔

میں نے ان واقعات کا اس لئے ذکر کیا کہ حکیم صاحب کی عظمت اور بڑائی قریب سے

دیکھنے پر اور بڑھتی تھی اور دور سے دیکھنے والے جس وجہ سے انھیں بڑا سمجھتے تھے، قریب والے بالکل دوسری وجہ سے انھیں اس سے زیادہ بڑا جانتے تھے۔ بڑے لوگوں کو اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لئے دنیا میں اکثر چھوٹوں سے الگ چھپا ہوا، کھنچا ہوا رہنا پڑتا ہے اور ٹھیک بھی ہے، قریب سے دیکھنے والے پر بہت سی وہ چھوٹی چھوٹی خامیاں ظاہر ہو جاتی ہیں جو دور والے کو نظر نہیں آتیں۔ حکیم اجمل خاں ان بڑوں میں تھے جو قریب سے اور بڑے ہو جاتے ہیں، دور سے دیکھنے والے جن کی عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے جن پر عاشق ہو جاتے ہیں۔

یہ نادر وصف صرف ان بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے جو صرف بڑے نہیں ہوتے بلکہ آدمی بھی ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کی صفت مرحوم میں جس درجہ موجود تھی میں نے اور کسی میں نہیں پائی۔ وہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے ہر جزو میں وہ تناسب اور ہمواری تھی جو اگر کسی ایک جزو میں حاصل ہو جائے تو آدمی کو بڑا بنا دیتی ہے، جس تمدن میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اس کے کسی ایک شعبے کا بھی کمال اگر اس کی ذات میں موجود ہو تو وہ اپنی جماعت کے لیے باعث فخر ہوتا ہے، لیکن یہ ایک ذات تھی جس میں ہندی اسلامی تمدن کے ہر شعبے کا کامل نمونہ موجود تھا، اور یہ بھی نہیں کہ جدید تمدن کے اچھے اثرات موجود نہ ہوں۔ قدیم تمدن کی گہرائی اور پختگی اور جدید کی بیداری اس ایک ذات میں آکر مل گئی تھیں اور افسوس کہ دوسروں میں اس اتحاد کو آنکھیں بے سود تلاش کرتی ہیں کہ پرانوں میں قدامت بے حسی و موت بن گئی ہے۔ نیوں میں جدت نے سطحیت اور اتھلے پن کی شکل اختیار کی ہے، پرانے تمدن کی جڑیں ہماری زندگیوں میں اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی سخت چٹان پر پہنچ گئی ہیں جس سے وہ غذا حاصل نہیں کر سکتیں، ہمارے نئے تمدن کی مثال خوشنما پھولوں کے اس گلدستے کی سی ہے جو درخت سے توڑ لئے گئے ہیں اور اگرچہ ابھی بہت شاداب نظر آتے ہیں، لیکن ان میں جڑیں نہیں، اس لیے ان میں ثبات بھی نہیں۔

ایک اجمل خاں کی ذات تھی جس کی جڑیں تمدن اسلامی کی گہرائیوں میں تھیں اور جس کے پھل پھول دیکھ کر نئے باغوں کے پھول بھی شرما جاتے ہیں، ہر شعبۂ تمدن میں، طب ہو کہ علم سیاست، معاشرت و مذہب ہو کہ فنون لطیفہ وہ سب میں مقلد بھی تھا اور مجتہد بھی۔ پچھلے جو دے سکتے تھے وہ سب اس نے لیا، لیکن یہ خیال کبھی ذہن سے نہیں ہٹا کہ اگلوں کو کچھ اور دے بھی جائے۔ اس کی غیور طبیعت کو کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ ماضی کا قرض بلا معاوضہ حال کی گردن پر رہے۔ اس لیے ان کی نظر ہمیشہ مستقبل پر تھی۔ طبیہ کالج کو دیکھو، ندوۃ العلماء کے اجلاس میں[۱] اس کے خطبۂ صدارت کو پڑھو، جامعہ ملیہ کے اس تخیل سے آگاہی پیدا کرو جو مرحوم کے پیش نظر تھا اور جس کی تکمیل کی سعی میں اس کی آخری سانسیں گذریں تو معلوم ہو گا کہ یہ دماغ محض کسی بڑے طبیب یا عالم یا سیاسی آدمی کا دماغ نہ تھا بلکہ ایسا دماغ تھا جو صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جن سے قدرت مستقبل کی تعمیر کراتی ہے۔ آج اجمل خاں ہم سے جدا نہیں ہوئے، ہندوستان اور مسلمانوں کے مستقبل کا سب سے بڑا معمار ہم میں سے اٹھ گیا۔ پرانی نسل اجمل خاں میں اپنے آخری نمونے کو رو رہی ہے اور نئی نسل اپنی دنیا کے ایک خلاق اور اپنی ممکنات مضمر کے ایک تشکیل دینے والے کے لیے نوحہ کناں ہے۔

دنیا میں بہت بڑے بڑے مرنے والے واقعی مر جاتے ہیں جب ان کا رشتہ صرف ایک نسل سے ہو، لیکن ماضی اور مستقبل دونوں سے رشتہ رکھنے والے نہیں مرتے اور اجمل خاں انھیں نہ مرنے والی ہستیوں میں ہے۔

جب موجودہ زمانے کے فن طب یونانی کا بڑا حصہ نامکمل اور ناقص ثابت ہو چکا ہوگا، (اور کونسا فن ہے جس کا نقص زمانہ ثابت نہیں کرتا؟) تو دہلی کے ایک دور افتادہ گوشے میں ایک طبیہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ ایک نئے فن طب کی تدوین و تخلیق میں مصروف

---

[۱] منعقدہ ۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء بہ مقام دہلی۔ (اعظمی)

ہوں گے اور ان کے کالج کی درودیوار پر اور خود ان کی زبان پر حکیم اجمل خاں کا نام ہوگا۔ جب "تعلیم جدید" کے حامی اپنی کوششوں کی مضرت سے واقف ہو چکے ہوں گے تو ملک میں متعدد تعلیم گاہیں اور تحقیقی ادارے ایسے ملیں گے جو اپنی کوششوں میں قدیم وجدید کا وہی امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہوں گے جو اجمل خاں کی زندگی میں نمونے کے طور پر موجود تھا اور ان سب کی راہ نما بھی اسی اجمل خاں کی یاد ہوگی۔ جب بہت سے لوگ قوم میں بیداری اور حرکت پیدا کرنے والے، قوم کے خواب غفلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی جیبیں بھر کر اس دنیا سے گذر چکے ہوں گے اور دنیا جیسا کہ اس کا قاعدہ ہے ان مصلحوں کو بھول چکی ہوگی تو اجمل خاں ہی کے نام لیواؤں میں ایسی جماعت ملے گی جو مسلمانوں میں گھر گھر صحیح تعلیم کی روشنی پھیلائے گی۔ جب مسلمانوں کو ان کی تعدادی نسبت کے مطابق ملازمت دلوانے والے خود کسی بڑی کرسی پر پہنچ کر اپنی اس جدوجہد کو بھول جائیں گے تو حکیم اجمل خاں کے یاد کرنے والے ہی اس بدنصیب قوم کو الکاسبُ حبیبُ اللہ کی بھولی ہوئی بشارت یاد دلا کر ان کی معاشی حالت کو درست کرنے میں ساعی نظر آئیں گے۔

کیوں؟ اس لیے کہ حکیم اجمل خاں کی تحصیل، جس قدر وسیع تھی، "تعمیر" و "تخلیق" کا جذبہ بھی اتنا ہی ہمہ گیر تھا اور یہی نہیں کہ اس کی تعمیری جدوجہد محض خیالات کی دنیا میں رہی ہو۔ اس نے اپنے کاموں کا پورا نقشہ خارج کے لیے بنا دیا ہے۔ سب کاموں کی بنیادیں وہ خود اپنے ہاتھ سے رکھ گیا ہے اور اس کا بھی انتظام کر گیا ہے کہ نئے معمار کمزور ہاتھوں سے سہی، رک رک کر اور آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن اُن بنیادوں پر وہ عمارت کھڑی کر دیں گے جو اس معمار قومی کی نظروں میں ہر وقت رہتی تھی اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کے نمونے سے اپنی محبت سے، اپنی نظر کے فیض سے ان نئے معماروں کے دل میں یقین و ایمان کا سرمایہ چھوڑ گیا ہے۔

جو لوگ مرحوم سے اپنے کسی جسمانی مرض کے لیے نسخہ لینا چاہتے تھے، جو کسی ملازمت

کے لیے سفارش کے خواہاں تھے، جنھیں کسی عزیز کی شادی کے لیے روپیہ درکار تھا، جس بیوہ کی روٹی مرحوم کی پوشیدہ توجہ سے چلتی تھی، جس یتیم کی تعلیم کے لیے اس کے خزانے سے روپیہ آتا تھا اور اس کی تعداد سیکڑوں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہے تو افسوس ہزار افسوس کہ اُن سے اجمل خاں ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، لیکن طب قدیم کا مجدد اور مسیحا، معاشرتی اصلاح و مذہبی رواداری کا علم بردار، قومی تعلیم کا راہ نما اجمل خاں زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا[1]، اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اُس کی مثال پیدا کر سکے گا، لیکن اجمل خاں زندہ ہے، وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔

---

[1] ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو ۲ بجکر ۱۵ منٹ پر انتقال فرمایا۔ (اعظمی)

دوسرے امیر جامعہ — ڈاکٹر مختار احمد انصاری
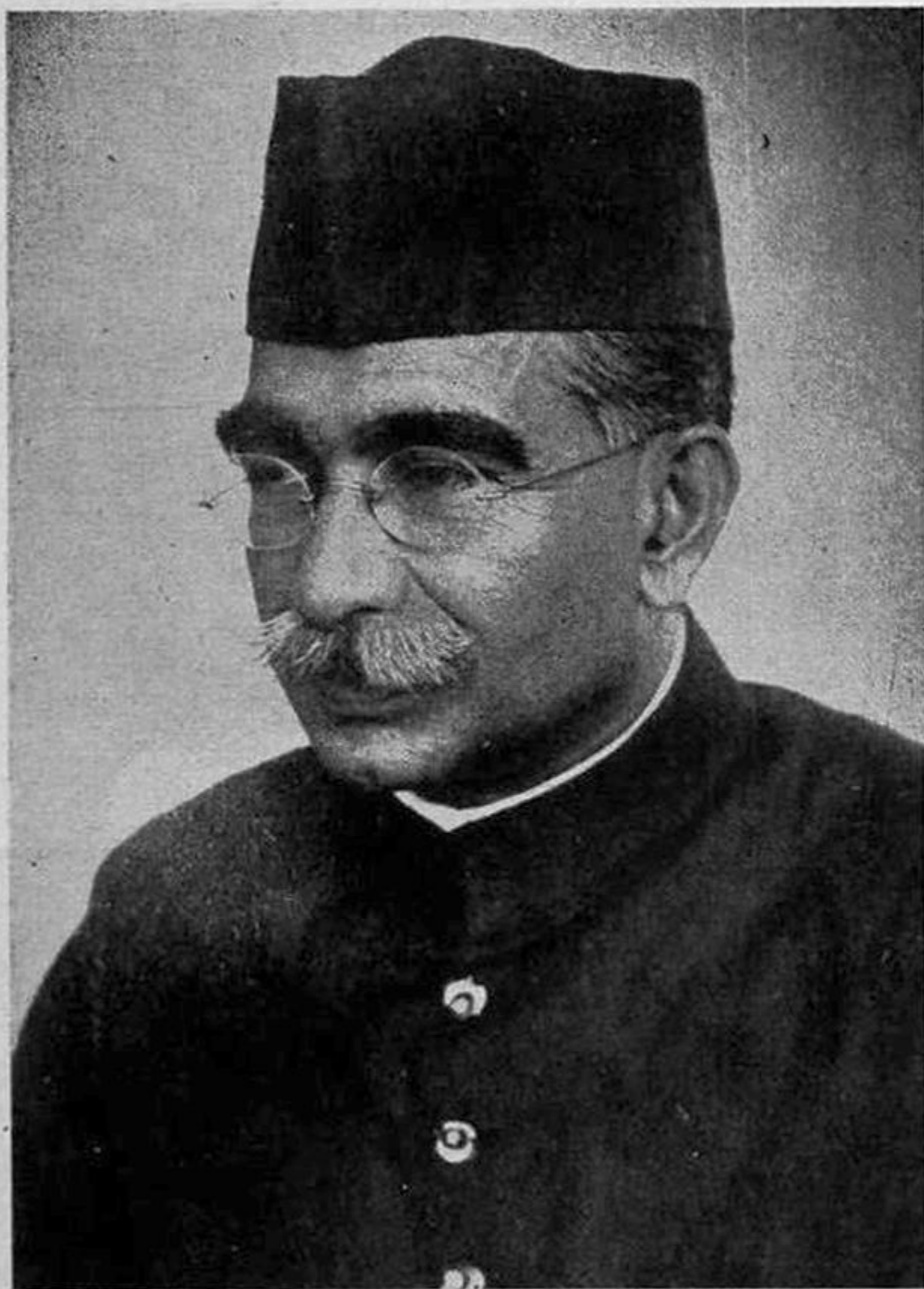
۱۹۲۸ — ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

دوسرے امیر جامعہ — ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۱۹۲۸ء ——— ۱۹۳۶ء

کل رات[1] کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے سوری تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہو گئی اور یہ بے شمار کاموں اور ان گنت قدر دانوں کو، اس دیس کو جس کی خدمت میں ساری عمر گذار کر ان کا براہی سنا، ان ہندو مسلمانوں کو جن میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کیا، ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر ان کا خون چلوؤں بڑھتا تھا اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں، ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو، سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا، اس دیس کے ہر بچے کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ اپنے پرائے سب کے لیے بہتا تھا، ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے

---

[1] ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء (اعظمی)

کام آتا تھا، ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں پر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدان عمل میں قدم رکھا ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا، اس لیے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے، مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے ۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے ۔ ان کی سوجھ بوجھ، تدبر، خلوص اور ایثار نے بہتیروں کو ان کا گرویدہ بنایا، لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ .... لوگوں پر اپنا جادو کیا ۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا ۔ پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دلوں پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سایہ میں رہتے تھے ۔ موت کی گھڑی سب کے لیے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپن سال کے تھے، ان کے لیے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ ٹلنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت، کچھ وصیت کرکے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے ۔ پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہونا تو وہی ہے جو اسے منظور ہو ۔ وہ اکیلے چل دئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے ۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری کی اولاد ہیں جن کے گھر مکہ سے مدینہ ہجرت کرکے قافلے کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا ۔ اس وقت جب مخالف اس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے، پر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی، اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہماں نوازی، فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے ۔ ڈاکٹر

صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا، لیکن بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہو کر ہندوستان واپس آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب انھوں نے دہلی میں فتحپوری پر اپنا مطب کھولا تو ان کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لیے اپنی پرکٹس چھوڑ دی، گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو خالی ہاتھ۔ پھر پرکٹس شروع کی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور یہ ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو موٹر بیچ کر، جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا، اُس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں، وہ کونسا سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا، نہ دن چین سے گذرتے تھے اور نہ راتیں، ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھا جاتا تھا اور ہمت تھی کہ مہمیز لگائے جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا پر اس سکون میں وہ کچھ اور بے چین تھے، کیونکہ مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت، اپنے سکھ اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دکھ پہنچے، ان کا ذکر اس وقت کیا کروں، اُنھوں نے اس پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا، ہم سب کو

ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے سر اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں، اس کے لئے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دھلے گی۔ اسی کام کی خاطر ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر کانگریس کی صدارت ۱۹۲۷ء میں منظور کر لی، اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی[1] اسی لیے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لیے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے، ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں، انھیں ترقی دیں، تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں، مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی کچھ ہمت بھی رکھتے ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے کہ وہ اس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا دکھی دل اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب اس مدرسے کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا، اس کے کام کرنے والوں سے کوئی آ آ کر شرما شرما کر یہ نہ کہے گا کہ وہ تمھارے لیے کچھ کام نہیں کر سکا، تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں، وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آ کر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں پر اس کے دکھی دل کا دکھ ہمیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کرائے گا بھی۔ ہمارا کام بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزاروں دولتیں ملیں گی پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہیں ملے گا۔

---

[1] ۲۹ر اپریل ۱۹۲۸ء کو ڈاکٹر صاحب جامعہ کی مجلس امناء کے صدر منتخب ہوئے۔ (اعظمی)

تیسرے امیرِ جامعہ — عبدالمجید خواجہ
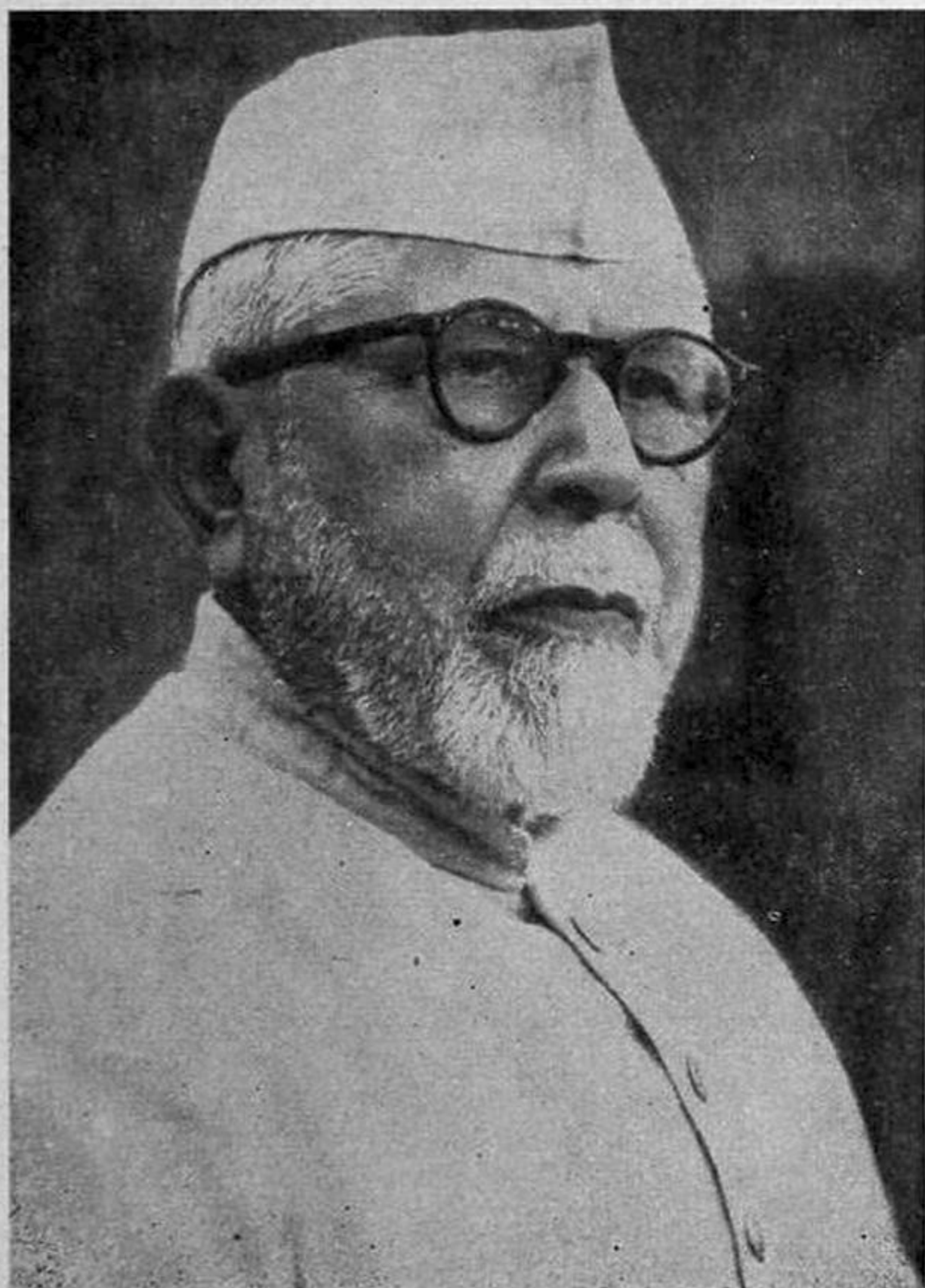
۱۹۳۷ — ۱۹۶۲ء

عبداللطیف اعظمی

تیسرے امیر جامعہ ــــــ عبدالمجید خواجہ

۱۸۸۵ء ــــــ ۱۹۶۲ء

امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب کے انتقال کی منحوس خبر ۲؍دسمبر (۱۹۶۲ء) کو موصول ہوئی، اس وقت جامعہ کے تمام ادارے بند ہو گئے اور ہر طرف رنج و غم کی فضا چھا گئی۔

خواجہ صاحب کا جامعہ سے تعلق روز اول سے رہا ہے، مشکل اوقات میں اس کو ہمیشہ اور ہر طرح کا سہارا دیا اور خون دل سے اس کی آبیاری کی۔ اگرچہ جامعہ کے بانیوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا، مگر ان کی خدمات بانیوں سے کم نہیں ہیں۔ مرحوم دوسرے شیخ الجامعہ تھے، جن کا مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ۲۹؍اپریل ۱۹۲۱ء کو انتخاب ہوا اور پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ کو سیاست کی ڈگر سے ہٹا کر تعلیم کی شاہراہ پر ڈالا۔ ان کے دور میں نازک سے نازک وقت آیا، مگر ہراساں اور مایوس ہو کر اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور اس وقت تک جامعہ کو کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے۔ جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے دو ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب جامعہ نہیں آ گئے۔ ۱۵؍مارچ ۱۹۲۶ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ منتخب ہوئے، تو خواجہ صاحب کو جامعہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اب جامعہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے، جو اس کو کبھی بند ہونے نہیں دیں گے۔ خواجہ صاحب اکثر فخر اور غرور کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میں جامعہ کو ایسے جاں نثار خدمت گذاروں کے ہاتھوں میں دے کر الگ

ہوا، جو جامعہ کو بہتر طور پر چلا سکتے تھے اور جو تعلیم کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے۔ زمانے نے ثابت کر دیا کہ خواجہ صاحب کا خیال کس قدر صحیح تھا۔

خواجہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کی مجھے عزت نصیب ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، جامعہ کے خلاف کچھ شورش پسندوں نے مختلف اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ لوگ خواجہ صاحب سے ملتے، ان کو خط لکھتے اور طرح طرح کی باتیں پہنچاتے۔ خواجہ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ جامعہ سے کوئی شخص ہر ہفتہ ان کے یہاں جایا کرے، تاکہ وہ جامعہ کے صحیح حالات سے واقف ہو سکیں اور جامعہ کے متعلق ان کو جو خطوط موصول ہوتے ہیں، ان کے جوابات لکھوا سکیں، یہ خدمت میرے سپرد ہوئی، ایک عرصے تک میں ان کی خدمت میں پابندی سے جاتا رہا۔ ان مواقع پر مجھے ان کی خلوت وجلوت سے آگاہی ہوئی، ان کے رجحانات کو سمجھنے اور ان کے خیالات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں جامعہ سے بے انتہا محبت اور خلوص ہے۔ وہ مولانا محمد علی مرحوم سے اس لئے خفا تھے کہ وہ جامعہ کی انفرادیت کو نہیں مانتے تھے اور چاہتے تھے کہ حالات سازگار ہوں تو مسلم یونیورسٹی میں اسے مدغم کر دیا جائے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ جامعہ اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور مسائل میں فرق کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اخبارات کو ایک بیان دیا، جس میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مذہبیت پر سختی سے نکتہ چینی کی۔ ایک صاحب نے اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں جامعہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھ سے جو خط لکھوایا تھا، اس میں جامعہ کی پوری حمایت اور مدافعت کی تھی، میں سنتا آیا تھا کہ وہ اپنی رایوں میں انتہائی بے لاگ اور بیباک ہیں۔ ان ملاقاتوں میں اکثر اس کے مشاہدے کا موقع ملا۔ باوجود اس کے کہ وہ کٹر نیشنلسٹ اور سچے کانگریسی تھے، مگر میں نے دیکھا ہے کہ کانگریسی رہناؤں کی موجودگی میں کانگریس کے کاموں اور حکومت کی پالیسی پر سختی سے نکتہ چینی کرتے، اسی طرح وہ مذہبی اقدار کے سخت حامی تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ "ایمان کے مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ تھے۔" مگر جماعت اسلامی کے ہمدردوں اور حامیوں کے

سامنے بعض ایسے عقائد اور مذہبی رسوم پر جنھیں بہت سے لوگ اسلامی سمجھتے ہیں سخت اعتراض کرتے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ ان کی قومی خدمات کی صحیح قدر نہیں کی گئی، مگر پھر بھی قومی کاموں میں ہر قسم کی خدمت کے لئے پیش پیش ہوتے۔

خواجہ صاحب ان چند لوگوں میں ہیں جو لڑ بھڑ کر جامعہ کو علی گڑھ سے دلّی لائے۔ وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ دلّی لے جانے کی کیسے کیسے اور کس کس طرح لوگوں نے مخالفت کی، میں نے کن کن مشکلات میں اور کس کس طرح جامعہ کا تمام اساسہ دلّی پہنچایا اور وہاں کی بے سر سامانی میں ایک ایک چیز کی کس کس جتن سے حفاظت کی۔ دلّی آنے کے بعد صحیح معنی میں جامعہ کا تعلیمی دور شروع ہوا اور حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ صاحب کی مشترکہ کوششوں سے جامعہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اس پوری کیفیت کو بڑے دلکش انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں :

"... مجھے یاد ہے جب علی گڑھ میں، کبھی تصدق مرحوم کے گھر میں، خواجہ کی کوٹھی میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے یہ تینوں بانی اور معمار جمع ہوتے تھے۔ محمد علی کا مجاہدانہ جوش ضد کرتا تھا کہ نہیں جامعہ کو تو قومی تحریک کے لئے رضا کاروں کے تیار کرنے کا ایک مرکز بنایا جائے اور اجمل خاںؒ اور انصاری کہتے تھے کہ تعلیم کے قدیم سرکاری مسلک سے یہ انحراف جس نے جامعہ کی صورت اختیار کی ہے مستقل اور پائدار ہونا چاہئے۔ کیا کیا مباحثے اور فریقین کے استدلال کی کیا کیا کشمکش اُن ہفتوں اور مہینوں میں جاری رہی۔ بالآخر مسلم نوجوانوں کی ایک نئی نسل کا یہ سانچہ تیار ہوا اور پہلے ہی دن سے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب نے اس کشتی کے پتوار اپنے ہاتھوں میں لئے۔ کاغذ کی کشتی ـــــ ارادوں اور تمناؤں کی یہ ناؤ جو اس زمانے کے طوفانی سمندر میں ڈالی گئی ـــــ رفتہ رفتہ لکڑی اور لوہے کی کشتی بن گئی، اس کے ٹوٹے ہوئے پتواروں اور بادبانوں کے بجائے رفتہ رفتہ نئے بادبان اور نئے پتوار اس ناؤ کو میسر آئے اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی کشاکش سے نکل کر بالآخر نوجوان ملاحوں کا قافلہ ایک ایسے بندرگاہ تک پہنچ گیا، جہاں سے ہر سال مسلمانوں کی ایک نئی نسل علم و عمل کا پیام لے کر ملک کے گوشے

گوشے میں پھیل رہی ہے۔"

خواجہ صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں دلچسپی لی، مگر ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد ۲۳ مئی ۳۷ء کو وہ امیر جامعہ منتخب ہوئے تو جامعہ کے معاملات سے بڑی حد تک بے تعلق رہے، انھوں نے یہاں کے کام کرنے والوں پر تمام تر بھروسہ کیا اور صرف خاص خاص اور اہم مواقع پر اپنے مشوروں سے نوازتے اور ضرورت ہوتی تو اپنی بے لوث خدمات پیش فرما دیتے۔ مگر آخری دور میں انھیں بہت اصرار تھا کہ ان کی ضعیفی اور صحت کی خرابی کے پیش نظر انھیں امیر جامعہ کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے۔ ۱۹۵۲ء میں جب ان کی مدت کار ختم ہوئی تو انھوں نے معتمد انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کو لکھ کر بھیجا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو امیر جامعہ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو شیخ الجامعہ منتخب کر لیا جائے۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ جا چکے تھے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اصرار کر کے انھیں امیر جامعہ رہنے پر راضی کر لیا، چنانچہ وہ حسب سابق امیر جامعہ منتخب ہوئے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ۔ نومبر ۶۰ء میں جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا، تو خواجہ صاحب نے جلسہ خاص میں اعلان فرمایا کہ انھوں نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، اب کسی اور کو امیر جامعہ منتخب کر لینا چاہیے۔ مگر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور جامعہ کے دوسرے بزرگوں نے ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ جامعہ کو جلد ہی یونیورسٹی کا درجہ ملنے والا ہے۔ انھیں بڑی خوشی ہوگی، اگر خواجہ صاحب کی سرپرستی میں جامعہ کو یہ اعزاز حاصل ہو۔ اگرچہ ان کا اصرار باقی رہا، مگر خدا کو منظور تھا کہ ان ہی کے دور میں جامعہ کو یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہو اور جامعہ سے ۱۹۲۱ء میں ان کا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ آخر دم تک باقی رہا۔

ابھی تک میں نے خواجہ صاحب کی زندگی کا صرف وہ رخ پیش کیا ہے، جس کا تعلق جامعہ

سے ہے، مگر قومی اور علمی خدمات بھی ان کی کچھ کم نہیں ہیں۔ جامعہ میں مرحوم کی یاد میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کی قومی خدمات کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا تھا۔ موصوف نے خواجہ صاحب کی خدمات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "خواجہ صاحب پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ تھے، پنڈت جی کی طرح خواجہ صاحب بھی ایسے باپ کے بیٹے تھے، جنھوں نے بڑی دولت چھوڑی تھی، خواجہ صاحب نے اپنی یہ دولت آزادی پر نچھاور کر دی۔ مسلم لیگ کا اس زمانے میں مسلمانوں پر جادو چل گیا تھا، خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو سمجھتے تھے کہ اس سے ملک کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا اور ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہوگی، اس لئے وہ تقسیم کی مخالفت کرتے تھے، خواجہ صاحب نے مسلم مجلس قائم کی مسلمانوں کے بہت سے لیڈر مسلم لیگ کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر احتیاط کے ساتھ، لیکن خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو احتیاط کو جانتے ہی نہیں، بے دھڑک اور بے لاگ کہتے تھے، ان کی تنقیدوں میں جوش اور غصہ نہیں ہوتا تھا، مگر بے لاگ ہوتی تھیں۔" آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "خواجہ صاحب کی خدمات میں جو زندہ رہیں گی، ان میں جامعہ ملیہ ہے، جو ان کے خلوص اور ایثار کی ایک جیتی جاگتی زندہ مثال ہے۔"

خواجہ صاحب کے انتقال پر اخبارات میں جو تعزیتی اداریئے لکھے گئے ہیں، ان میں مرحوم کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے اور ان کی زندگی کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اس لئے ذیل میں ان کے اہم حصے پیش کئے جاتے ہیں:

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان کے حالات زندگی کے متعلق لکھتے ہیں: علی گڑھ سے اخلاص ترکے میں پایا تھا، ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہی ہیں جو ابتدا تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ برابر کے سہیم و شریک تھے۔ علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے، کیمبرج سے بی اے کیا، لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے، واپسی پر بیرسٹری پہلے پٹنہ میں شروع کی، پھر علی گڑھ میں اس کے بعد الٰہ آباد ہائی کورٹ میں۔ آخر میں سالہا سال سے پھر علی گڑھ آگئے تھے اور سارا وقت

قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ اخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے، قومی اور ملی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہماک، صحت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔" روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) نے لکھا ہے کہ" خواجہ صاحب بہت پکے مسلمان تھے اور اتنے ہی پکے قوم پرور بھی تھے۔ وہ اس زمانے کی بہت سی اصلاحوں اور آزادیوں کے خلاف تھے اور پرانی روایات اور اقدار کے زبردست حامی تھے۔ مذہبی پابندیوں کی وہ قدر کرتے تھے اور نئی نسل کو اسی راہ پر تربیت دینا چاہتے تھے۔" ہفتہ وار ندائے ملت (لکھنؤ) اپنی ۱۵ دسمبر کی اشاعت میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتا ہے: "..... تحریک خلافت کے علاوہ جنگ بلقان وطرابلس میں ترکوں کی حمایت کی تحریک اور آزادی کی جملہ تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے، جیل بھی گئے اور دوسری قربانیوں کے میدان میں بھی آگے آگے رہے، خلافت کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، ایک زمانے میں تو کانگریس کے سکریٹری بھی رہے ہیں۔ آپ کی کوٹھی سیع منزل ہمیشہ سیاسی اور علمی و ادبی مجلسوں کا مرکز رہی ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۷ برس[1] تھی۔

---

[1] تاریخ پیدائش: اکتوبر ۱۸۸۵ء

چوتھے امیر جامعہ — ڈاکٹر ذاکر حسین
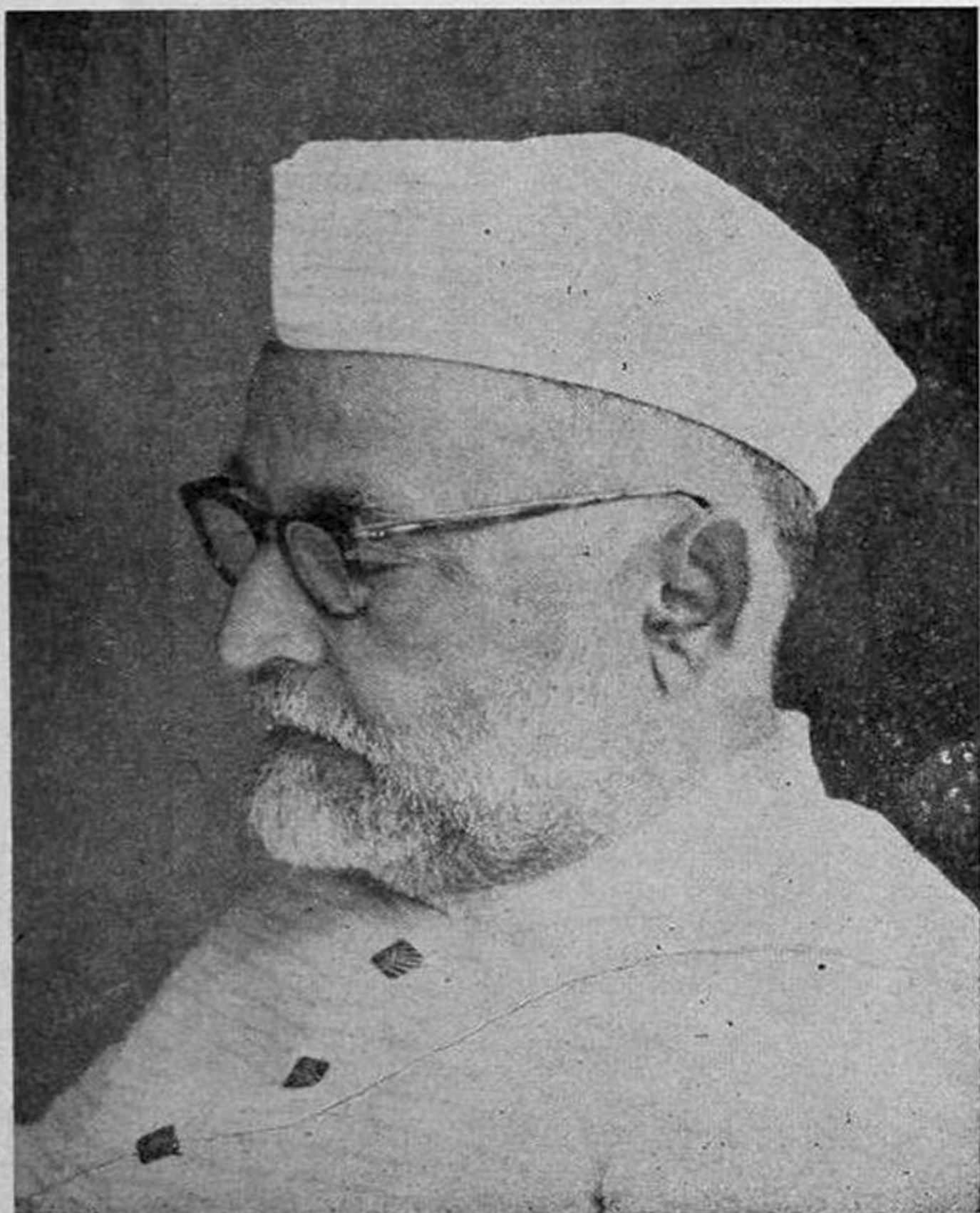
۱۹۶۳ — ۱۹۶۹ء

پروفیسر محمد مجیب

چوتھے امیر جامعہ ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین

۱۹۶۳ء ـــــ ۱۹۶۹ء

مجھے حال ہی میں معلوم ہوا ہے کہ جامعہ ملیہ کو قائم کرنے کی تحریک قوم کے ان رہنماؤں نے نہیں کی جن کے نام اس سلسلے میں بتائے جاتے ہیں۔

مہاتما گاندھی استادوں اور طالب علموں کو اس پر آمادہ کرنے کے لئے کہ وہ سرکاری درسگاہوں کو چھوڑ دیں ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ ایک خاص تاریخ کو وہ علی گڑھ آنے والے تھے، اور یونین میں ان کی تقریر ہونے والی تھی۔ ذاکر صاحب جو اس وقت آدھے طالب علم، آدھے استاد تھے، اور طالب علموں میں ممتاز اور ان کے ایک خاص گروہ میں ہر دل عزیز تھے، چاہتے تھے کہ اس جلسے میں ضرور شریک ہوں۔ لیکن انھیں اپنے علاج کے لئے دلی بھی آنا تھا، جہاں وہ ڈاکٹر انصاری مرحوم سے وقت لے چکے تھے، اور اتفاق سے جو تاریخ انھوں نے دلی جانے کے لئے مقرر کی تھی اسی تاریخ کو علی گڑھ میں مہاتما جی کی آمد ہوئی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ جلسے کا وقت ایسا طے ہو کہ وہ دلی سے واپس آکر اس میں شریک ہوسکیں، مگر جب وہ اسٹیشن پہنچے تو ان کے کئی دوست ان کا استقبال اور انھیں یہ خوش خبری سنانے کے لئے آئے ہوئے تھے کہ مہاتما جی کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مہاتما جی کی تقریر کا بنارس ہندو یونیورسٹی کے طالب علموں اور استادوں پر بھی کارگر اثر نہیں ہوا، لیکن وہاں پنڈت مدن موہن

مالویہ جلسہ میں موجود تھے۔ علی گڑھ میں کوئی بات آداب کے خلاف جلسے میں تو نہیں ہوئی، البتہ جلسے کے بعد مہاتما جی کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ ذاکر صاحب علی گڑھ اسٹیشن پر اترے تو مذاق اڑانے کا سلسلہ جاری تھا اور اس میں ان کے اپنے دوست بھی شریک تھے۔

ذاکر صاحب کو اس وقت تک مہاتما گاندھی سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی۔ مہاتما جی نے اپنی اخلاقی حکومت رفتہ رفتہ قائم کی، پہلے ان کے ماننے والے بہت کم تھے، وقت کے ساتھ بڑھتے گئے۔ مسلمان تقریروں میں جس انداز بیان کو پسند کرتے تھے اسے دیکھتے ہوئے اس کا امکان بہت کم تھا کہ مسلمانوں میں وہ اپنے قوت بیان کی وجہ سے اثر پیدا کریں، اور ہمیں علی گڑھ کے ان طالب علموں کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہیئے جنھیں ان کی تقریر سننے کے بعد ان سے عقیدت پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن تمسخر اور تحقیر کے جس انداز سے مہاتما جی کی تقریر اور ان کے مقصد پر فقرے چست کئے گئے اس سے ذاکر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی۔ ایسی فضا میں جیسی کہ اس وقت علی گڑھ میں تھی اعتراض یا نصیحت کرنا یا سیاست اور تہذیب کا دوسرا رخ پیش کرنا بیکار تھا، پھر بھی ذاکر صاحب اگلے دن اس جلسے میں گئے جس میں طالب علم مہاتما جی کی اس تحریک پر بحث کرنے والے تھے کہ استاد اور طالب علم سرکاری درس گاہوں کو چھوڑ دیں۔ انھیں بخار تھا اور وہ بحث میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے، مگر اس فریق کی تائید کئے بغیر نہ رہ سکے جو مہاتما گاندھی کی تحریک کے موافق تھا۔ اسی فریق کی مخالفت میں کسی نے طعنہ کے انداز میں کہا کہ جو لوگ موجودہ درسگاہوں کو چھوڑنے کی تلقین کر رہے ہیں انھیں یہ بھی بتانا چاہیئے کہ ان درسگاہوں کو چھوڑنے والے جائیں کہاں۔ یہ علی گڑھ کے مقابلے میں ایک قومی درسگاہ قائم کرنے کا چیلنج تھا جسے ذاکر صاحب نے دل میں قبول کیا۔ وہ دہلی آئے اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور دوسرے لیڈروں سے مل کر انھیں یقین دلایا کہ علی گڑھ میں ایک قومی درسگاہ قائم کی جاسکتی ہے اگر قوم کے رہنما ان دوستوں اور طالب علموں کو سہارا دیں جو اس میں تعلیم دینے اور تعلیم پانے کے لئے تیار ہیں۔ قومی لیڈر بغاوت کے ایسے ہی

آثار کے منتظر تھے۔ انھوں نے بہت جوش کے ساتھ ایک قومی درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو اپنا لیا اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آگئی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کا کام فروری مارچ ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ اس وقت خواجہ عبدالمجید صاحب مرحوم شیخ الجامعہ تھے، اور جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کیا جا چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے اس وقت تک یہ بات رفتہ رفتہ ظاہر ہو گئی تھی کہ جامعہ میں کون بغیر کسی شرط کے کام کرنے پر تیار ہے کون نہیں ہے، اور ان شرطوں میں جن کے بغیر کام کرنا شرط تھا ایک یہ بھی تھی کہ چاہے جامعہ کے مقصد پر گفتگو اور بحث کی جائے، اس کے کاموں کو لاحاصل قرار دیکر اسے چھوڑا نہ جائے۔ غالباً یہ اکتوبر ۱۹۲۰ء اور ستمبر ۱۹۲۳ء کے درمیان سمجھ لیا گیا تھا کہ جامعہ کی غیر مشروط خدمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ صلاحیت ذاکر صاحب میں ہے اور انھوں نے جرمنی سے واپسی پر شیخ الجامعہ کے فرائض اس طرح انجام دینا شروع کر دیا کہ گویا وہ رخصت سے واپس آئے ہیں۔

جامعہ میں اس وقت تھا کیا؟ اسکولوں اور کالج کو ملا کر قریب ۸۰ طالب علم، اور پچیس تیس استاد جن میں ہر ایک کی اپنی جداگانہ شخصیت اور نفسیاتی مسائل تھے۔ ایک بیرک نما عمارت ہوسٹل اور بیشتر استادوں کی رہائش کے لئے تھی، اور کتب خانہ، دفتروں اور کلاسوں کے لئے تین اور کرائے کی عمارتیں، جن میں سے دو کے ساتھ چند کوٹھریاں تھیں۔ مہاتما جی جامعہ کے علی گڑھ سے منتقل ہوتے وقت ایک سال کا خرچ دے چکے تھے، اس کے بعد سے جامعہ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنا امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ طالب علموں کی تعداد ایک معمولی مدرسہ سے بھی کم تھی، مگر ۱۹۲۶ء کے شروع کے طالب علموں میں سے بیشتر اور استادوں کارکنوں میں سے تقریباً سب ایسے تھے جو اس وقت جب علی گڑھ میں جامعہ کو بند کرنے کا معاملہ زیر غور تھا اس کا اعلان کر چکے تھے کہ وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں

گے، چاہے لیڈروں میں سے کوئی ان کا سرپرست اور مددگار بننے پر تیار نہ ہو۔ یہی ارادہ جامعہ کا اصل سرمایہ تھا۔ اسی کے بل پر اپنے آپ کو اور دوسروں کو یقین دلاتا تھا کہ جامعہ ملیہ آزاد قومی تعلیم کا نمونہ اور تعلیم کی ایک نئی تحریک کا پیش خیمہ ہے۔

کسی تاریخی شخصیت کے عمل کو سمجھنے کے لئے سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی جگہ پر تصور کریں اور تمام حالات اور تمام لوگوں کو نظر میں رکھ کر سوچیں کہ ہم ہوتے تو کیا کرتے۔ اپنے آپ کو اس "مسند" پر تصور کیجئے جس پر ذاکر صاحب صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے سے سہ پہر کو ساڑھے چار پانچ بجے تک بیٹھتے تھے۔ بعض استادوں کا دستور رہے کہ گھنٹہ خالی ہو تو آکر شیخ الجامعہ کے دفتر میں بیٹھ جائیں اور ادھر ادھر کی باتیں، یعنی گپ کریں۔ یہ بزرگ ہیں، ان کا لحاظ کرنا ضروری ہے، خود ان سے کام کی بات کی نہیں جا سکتی، ان کی موجودگی میں وہی باتیں ہو سکتی ہیں جن سے ان کو دلچسپی ہو۔ ان کے علاوہ جو لوگ ملنے آتے ہیں وہ یا تو ضرورت بیان کرکے روپے کا مطالبہ یا ساتھیوں میں سے کسی کی شکایت کرتے ہیں۔ آمدنی کا ذریعہ بس یہ ہے کہ کسی فرض شناس باپ نے بیٹے کی فیس بھیجدی یا مکتبہ کی کچھ کتابیں بک گئیں۔ حکیم اجمل خاں مرحوم کو جامعہ کی خراب مالی حالت کا بڑا دکھ ہے، مگر ان سے اصرار کے ساتھ کہا بھی نہیں جا سکتا کہ جو کچھ کرنا ہے جلد کیجئے۔ وہ خود سوچتے رہتے ہیں کہ کیا کرنا چاہئے، کس سے، کس وقت اور کہاں ملنا چاہئے، اصول اور عقیدے کی خلاف ورزی کئے بغیر جامعہ کی قوم پرستی اور حکومت شکنی سے کس طرح نظر اور توجہ ہٹا کر جامعہ کی اہمیت کو واضح کرنا چاہئے، جامعہ کی نازک مالی حالت پر پردہ ڈال کر کس طرح دینے والے کو یقین دلانا چاہئے کہ اس کا روپیہ ایک ترقی پذیر کام میں صرف ہوگا۔ ان سب باتوں کے بارے میں غور کرنے کے لئے ملاقات کی ضرورت ہے، اور اس وقت بڑے آدمیوں سے ملنے کی یہی صورت ہے کہ ان کی مصاحبت کی جائے۔ حکیم صاحب جب کبھی بلا بھیجتے ہیں تو امید بندھتی ہے کہ روپے کا کچھ انتظام کیا جائے گا، مگر اکثر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے لئے وقت نہیں ملا اس لئے کہ حکیم صاحب کی ذمہ داریاں

اور مجبوریاں بہت ہیں، اور جانے آنے میں اپنی جیب سے کچھ خرچ ہو گیا۔ حکیم صاحب جن لوگوں سے روپیہ حاصل کرنے کے خیال سے ملاتے ہیں ان کے پاس غریب بن کر جائیے تو ان کی نظروں سے گر جائیں گے اور بے غرض بن کر خودداری سے ملئے تو انھیں جامعہ کی ضرورتوں کا احساس نہ ہوگا۔ اگر کسی کو جامعہ بلانا اور جامعہ کا کام دکھانا ہو تو کیا کیجئے گا، جامعہ میں دکھائیے گا تو کیا دکھائیے گا، اور جلسے اور نمائش میں کچھ خرچ کرنا ہوا تو وہ کہاں سے آئے گا۔ پھر لوگ ہیں کہ وقت بیوقت تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ کہیں سے کچھ لائیے تو کام چلے، گویا جامعہ وہ ہیں اور ان کی ضرورتیں۔ کبھی مشورہ کیجئے کہ جامعہ کو ترقی دینے کے لئے کیا کرنا چاہیے تو سب کہتے ہیں کہ یہ باتیں تو آپ ہم سے بہتر سوچ سکتے ہیں، ایک دو ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں اور جوش آجاتا ہے تو کہہ بھی دیتے ہیں کہ جامعہ کے کاموں کو ترقی دی جا سکتی ہے، روپیہ مل سکتا ہے اگر چندہ جمع کرنے کی سکیم بنائی جائے اور شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر میں بیٹھے رہنے کے بجائے چندہ جمع کرنے میں اپنا وقت صرف کریں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ سہی، مگر جامعہ کا ایک اعلیٰ دینی اور قومی مقصد بھی تو تھا جس کی خاطر ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کی جا سکتی تھیں۔

جامعہ کو قائم کرنے کا ایک مقصد علم کو دین کے رنگ میں رنگنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بنیادی شرط یہ تھی کہ دین کا تصور واضح ہو اور فن تعلیم کے ایسے ماہر موجود ہوں جو علم کو دین کا اور دین کو علم کا رنگ دے سکتے ہوں۔ دین کا تصور واضح کرنے کا حوصلہ کون کر سکتا تھا؟ عربی اور دینیات کے استادوں میں سے ایک وہابی خیال کے تھے، وہ پنج وقتہ نماز اور روزے کی پابندی کے علاوہ سر منڈا رکھنا، مونچھیں کتروانا اور ٹخنے سے اونچا پائجامہ پہننا لازمی سمجھتے تھے اور نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنا یا ان سے ہاتھ ملانا اتنا برا مانتے تھے کہ ایک موقعہ پر مسز نائیڈو انتہائی کوشش کے باوجود انھیں آمادہ نہ کر سکیں کہ ان کی طرف دیکھیں اور ایک مرتبہ جلسے میں جب مرحومہ بیگم بھوپال سے ان کا تعارف کرایا گیا اور بیگم صاحبہ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے یہ کہہ کر مصافحہ سے انکار کیا کہ میں

نامحرم عورتوں سے ہاتھ ملانا غلط سمجھتا ہوں۔ ایک دو شیعہ اور غیرمسلم استادوں کو چھوڑ کر باقی سب سنی حنفی تھے، جن میں سے بعض ہر وقت اسلام کی بات کرتے تھے، مگر روزہ نماز کے زیادہ پابند نہ تھے، بعض روزہ نماز کے پابند تھے مگر اسلام کی بات کم کرتے تھے، جسے عام طور پر دینداری کہتے ہیں اس کی مثال پیش کرنے کا شوق کسی کو نہ تھا۔ ایسی حالت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ جامعہ میں بچوں اور نوجوانوں کو اچھے مسلمان بننا سکھایا جاتا ہے۔ دوسری طرف فن تعلیم سے واقفیت رکھنے والے استاد بھی نہیں تھے، اور دینیات کے نصاب میں نئے تجربے کئے بھی جاتے تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا، اس لئے کہ دینیات کے استاد صرف پرانے ڈھنگ پر تعلیم دے سکتے تھے۔ گویا جامعہ کی تعلیم کو دین اور علم کو سمونے کا ایک تجربہ ثابت کرنا تقریباً ناممکن تھا، اور دین اور ملت سے دلچسپی رکھنے والے وہ مسلمان جن کی دولت سے مدد حاصل کی جا سکتی تھی جامعہ کے قومی رنگ کو ناپسند کرتے تھے اور اس سے الگ ہی رہنا چاہتے تھے۔

جامعہ کا دوسرا مقصد تعلیم کی ایک نئی تحریک شروع کرنا تھا جس کا سارے ملک کی زندگی پر اثر پڑے۔ یہ کام بعد کو بنیادی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں ہوا۔ ۲۶ء میں پہلے کی ایک تجویز کے آثار نظر آتے تھے کہ جامعہ میں صنعتی تعلیم دی جائے۔ ان آثار میں دو ہینڈ پریس، ایک کاتب، ایک مصلح سنگ اور ایک پریس مین تھا، کچھ سامان تھا جس سے خیال ہوتا تھا کہ فوٹوگرافی سکھانے کی سکیم ذہن میں تھی، مگر سامان سب انمل بے جوڑ تھا، کچھ تالے اور اوزار قفل سازی کی سکیم کی یادگار تھے۔ جامعہ میں بعض لوگ تھے جن کے نزدیک سب سے اہم کام شبینہ مدرسے قائم کرنا تھا، بعض جامعہ کے مدرسوں کے نمونے پر دوسرے مدرسے کھولنا چاہتے تھے، جامعہ کی ایک شاخ رنگون میں تھی، ایک نیا مدرسہ باڑہ ہندو راؤ میں قائم کیا گیا۔ کچھ لوگ ان تجربوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے، مگر انھیں تجربوں پر جامعہ میں لوگ ہنستے بھی تھے۔

یہ تھے وہ حالات جنھیں ذاکر صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے نظر میں رکھنا چاہئے

اب اسی سمجھنے کی کوشش کی تکمیل کے لئے حالات کو ذاکر صاحب کی نظروں سے دیکھیے۔ کسی کے دل میں گھس کر ساری حقیقت معلوم کر لینا ممکن نہیں، اور کوئی شخص خود اپنا سارا حال بتانا چاہے تو بھی شاید نہ بتا سکے گا۔ لیکن ذاکر صاحب اور جامعہ کے تعلق کی کہانی خود ان کی زبانی بیان ہوتی تو شاید اس طرح سے ہوتی :

"جامعہ قائم ہو گئی ہے، اسے قائم رکھنا ہے، ہر حال میں قائم رکھنا ہے۔ اس کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے، کام کرنے والوں کی ضرورت ہے، مگر سب سے زیادہ صبر اور ہمت کی ضرورت ہے، ایسے صبر کی نہیں جو آدمی میں صرف برداشت کی طاقت پیدا کرے بلکہ ایسے صبر کی جو عزم کی صورت بن جائے، حالات پر غالب آنا سکھائے، جو موجود ہو، محسوس نہ ہو، جیسے صوفیوں کا فاقہ، کہ چہرے کو رونق اور دل کو سرور بخشتا تھا۔ ہاں، اور ہمت بھی ایسی چاہیئے جو خود اپنے اندر روانی کی طاقت پیدا کرے، کسی شخص، کسی امید، کسی خیال کی دست نگر نہ ہو، جو پرندکی طرح سبز باغ اور ویرانہ دونوں کے اوپر سے آزادانہ اڑتی ہوئی گذر سکے، جسے اپنی آزمائش کے لئے مخالفوں کی تلاش نہ ہو، بلکہ جو لطف اور مروت بن کر مخالفوں کو دوست بنا لے جو دنیاوی حیثیت اور اقتدار رکھنے والوں کے سامنے سر کو نہ جھکنے دے، نگران کی کوتاہیوں سے بیزار نہ ہونے دے اور ان سے مصلحت اور تہذیبی حسن کے ساتھ اپنے کام نکالنے کا طریقہ بتاتی رہے۔ جامعہ میں جو لوگ ہیں ان سے صبر اور ہمت کا ذکر کیا جائے تو نہ معلوم کیا سمجھیں گے، وہ تو چاہتے ہیں کہ انھیں مطمئن رکھا جائے۔ انھیں مطمئن رکھنے کے لئے خود مجھے ہر وقت مطمئن اور مطمئن ہی نہیں، تازہ دم معلوم ہونا چاہیئے، وہ اگر اس بات پر خفا ہوں کہ میں روزمرہ کے کاموں میں لگا ہوں، تنخواہوں کے لئے روپیہ لانے کی دوڑ دھوپ سے بچتا ہوں تو کچھ بہت ہرج نہیں، اس سے میرا اپنا اطمینان ظاہر ہوتا ہے، روپیہ کے لئے بہرحال موافق حالات کا انتظار کرنا ہے۔ لیکن لوگوں کو مطمئن رکھنے کی اور تدبیریں بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک تدبیر یہ ہے کہ نئے کام کا یا پرانے کاموں کو بہتر کرنے کا کوئی خیال ذہن میں آتا ہے۔ اور فکر

ہے کہ ایسے خیال مسلسل ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ تو جو بھی ملتا ہے اس سے اپنے خیال کو بیان کرتا ہوں، اسے دعوت دیتا ہوں کہ اس خیال کو عمل میں لائے یا مجھے مشورہ دے کہ اسے کس طرح سے عمل میں لایا جائے۔ دراصل میں یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اپنی طبیعت سے مجبور ہوں، اور اس کا حساب نہیں رکھتا کہ کتنے خیال بیان ہو کر بھلا دئے گئے، مگر اس کا مجموعی اثر جامعہ والوں پر یہ پڑتا ہے کہ ہر ایک جامعہ کے کاموں کو ترقی دینے کی فکر میں الجھا رہتا ہے، اور نہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ فکرمند نہ رہا تو جامعہ نہ چل سکے گی۔ اگر جامعہ والوں میں سے کوئی اپنے شوق سے کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو میں اس کی ہمت افزائی کرتا ہوں، اس لئے کہ کوئی کام بھی جم جائے تو اس سے مفید نتیجے نکل سکتے ہیں، اور اگر کوئی ارادہ غلط ہو تو بہتر ہے کہ ارادہ کرنے والا خود اپنی غلطی کو محسوس کرے۔

"جامعہ والے مجھ سے آکر ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں، اور محاسب کے طریق کار سے سب بیزار ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے، جس انداز سے کوئی بات شروع کرتا ہے میں بھانپ لیتا ہوں کہ اس کا اصل مدعا کیا ہے، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جامعہ میں جیسے لوگ ہیں بہت غنیمت ہیں۔ ان کو جامعہ سے محبت ہے، ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ جامعہ کو نہ چھوڑیں گے، اور تھوڑی سی ہمدردی اور ہمت افزائی انھیں ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کرنے پر آمادہ کرسکتی ہے۔ اب یہ میرا فرض ہے کہ جس میں جیسی صلاحیت ہے ویسا اس سے کام لوں، اور جس میں کوئی صلاحیت نہ ہو اسے بھی مصروف رکھوں....

"یہ لوگ بہت پریشان ہوتے ہیں تو ایک دوسرے سے اور مجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے۔ میں موقع کی مناسبت سے کوئی جواب دیدیتا ہوں، یا مقصد طے کرنے کی ذمہ داری انھیں پر ڈال دیتا ہوں۔ خدا نے ذہانت دی ہے، بیان کی قوت دی ہے، مجھے یقین ہے کہ جامعہ رفتہ رفتہ ترقی کرتی رہے گی، اور یقین اتنا پختہ ہے کہ اپنے اوپر ہنس لیتا ہوں اور جب دل بھر آتا ہے تو دوسروں کو رلا سکتا ہوں۔ خوب ہے جامعہ کی زندگی، کہ اس میں

سترِ فاقہ کا مزہ بھی ہے اور سترِ عبادت کا بھی ...."

جس شخص نے بیس برس سے زیادہ ایک ادارہ کی رہنمائی کی ہو، اس کے علاوہ بنیادی تعلیم کو بڑے پیمانے پر رواج دیا ہو اور غالباً بلا استثنار ہر ایک کو جو اس سے ملا اپنی قابلیت سے متاثر کیا ہو خود اس کی مردم شناسی پر شبہ کرنا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر بہت سے لوگوں پر جنھوں نے اپنی شخصیت اور قابلیت کی بنا پر غیر معمولی امتیاز حاصل کیا ایسا ہی شبہ کیا جاتا ہے۔ شاید بات یہ ہے کہ مردم شناسی کی کمی کا الزام لگانے والے خود مردم شناس نہیں ہوتے، یا قابلیت اور دوسری خوبیوں میں اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتے، اس لئے انتخاب کی نظر جا ہے جس پر پڑے، وہ کہتے ہیں کہ غلط شخص پر نظر پڑی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ انتخاب کرنے والے کو آزادی کتنی ہے، اور انتخاب کے لئے اسے آدمی کتنے ملتے ہیں۔ ذاکر صاحب سے اس رائے میں جامعہ والے سب اتفاق کرتے تھے کہ جامعہ کے تمام شعبوں اور تمام کاموں کو بڑھنا اور اس طرح ترقی کرنا چاہیئے کہ وہ قوم کی نظروں کے سامنے آئیں اور قوم کو جامعہ کی طرف متوجہ کریں، لیکن وسائل اتنے نہیں تھے کہ ہر شعبے کی ترقی کے لئے ایک ساتھ انتظام کیا جاسکے، اور یہ طے کرنا ضروری تھا کہ ترقی کی کوشش کہاں سے شروع کی جائے۔ کوشش کو محدود کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وسائل جتنے بھی تھے بیشتر اسی میں لگائے جائیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ اس خاص شخص کے مطالبوں کو جس کے سپرد کوئی نیا کام کیا گیا ہو دوسروں کے مطالبوں پر ترجیح دی جائے۔ یہ بات ظاہر ہے ان لوگوں کو گراں گذرتی تھی جن کو وسائل کی کمی کے سبب سے پہلے بھی کافی نہیں ملتا تھا۔

ذاکر صاحب کی ایک ابتدائی تجویز یہ تھی کہ بچوں کے لئے کتابچے لکھے جائیں، اس غرض سے مکتبہ کو روپیہ دیا جائے اور اس کا کام جامعہ کے دفتر سے الگ کیا جائے۔ مکتبہ کو کاروباری طریقے پر چلانے کے لئے حامد علی خاں مرحوم سے زیادہ موزوں اس وقت جامعہ میں کوئی نہیں تھا، لیکن جامعہ کی بھائی چارہ کی فضا میں کاروباری طریقے کو برتنے سے خاصی کشمکش پیدا ہوئی،

اگرچہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ مکتبہ کسی اور طریقے پر کامیابی کے ساتھ چلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ذاکر صاحب کی اسی دور کی دوسری تجویز یہ تھی کہ مدرسہ ابتدائی کو نمونہ کا مدرسہ بنایا جائے۔ اس کے لئے کسی استاد کو کسی اچھے استادوں کے مدرسے میں تربیت کے لئے بھیجنے اور اس کے بعد مدرسہ کو اس کے سپرد کرنے کی ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب کی نظر انتخاب عبدالغفار مدھولوی صاحب پر پڑی، جنھیں شاید اور کوئی شخص بھی اس فریضہ کے لائق نہ سمجھتا۔ لیکن اس سے بہتر انتخاب کیا نہیں جا سکتا تھا۔ عبدالغفار صاحب موگا بھیجے گئے، وہاں انھوں نے مدرسے کے استادوں کو اپنی محنت اور شوق کی وجہ سے حیرت میں ڈال دیا، اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ مدرسہ ابتدائی کے نگراں مقرر ہوئے تو ان کے شوق اور انہماک نے مدرسے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ لیکن ایک استاد پورا مدرسہ نہیں بن سکتا، استادوں کی بہرحال ضرورت تھی۔ مدرسہ ثانوی کے ایک استاد سے کہا گیا کہ وہ ابتدائی میں بھی پڑھایا کریں تو انھوں نے اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا، اور ان کی ضد میں خود ذاکر صاحب نے ابتدائی کے ایک کلاس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف عبدالغفار صاحب کی باضابطگی ایسی تھی کہ کوئی استاد ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب کسی جلسے کی صدارت کے لئے چند منٹ دیر سے پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ جلسہ شروع ہو گیا ہے اور اس کی صدارت کوئی اور کر رہا ہے۔ ذاکر صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور عبدالغفار صاحب کی قدر ان کی نظروں میں بہت بڑھ گئی، مگر جامعہ میں مروت اور رعایت کی جو فضا تھی اس میں عبدالغفار صاحب کی باضابطگی کو سراہنے والے بہت کم تھے۔ عبدالغفار صاحب چند سال بعد نگرانی سے علیٰحدہ ہو گئے، ایک استاد کی طرح پہلی یا دوسری جماعت کو پڑھاتے رہے۔ ابتدائی مدرسے کی حالت کبھی بگڑی کبھی سدھر گئی، مگر جو جان عبدالغفار صاحب نے اس میں ڈال دی تھی وہ اب تک باقی ہے۔ تیسرا نمایاں کام جو اس ابتدائی دور میں ہوا ایک شعبہ کا قیام تھا جو ہمدردانِ جامعہ کہلاتا تھا اور جس کا مقصد جامعہ کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ معلوم نہیں یہ تجویز ذاکر صاحب کی تھی یا مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی کی۔ یہ بہت کامیاب ہوئی اور روپیہ

جمع ہونے کے علاوہ اس شعبے کی بدولت جامعہ کا سارے ملک میں چرچا ہو گیا۔ مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ جامعہ کے استاد چندہ جمع کرنے کے کام میں شریک ہوں۔ مرحوم شفیق صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ سب سے اپنا کام کرا لیتے تھے، پھر بھی یہ سوال ہر وقت اٹھتا رہتا تھا کہ استاد چندہ جمع کرنے کے کام میں لگے رہیں یا تعلیم کا کام کریں۔ غالباً خود ذاکر صاحب کو وہ دوڑ دھوپ پسند نہ تھی جو بہت سے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی رقمیں جمع کرنے کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ اس میں اصل آزمائش صبر اور استقلال اور "پارے رہ پیا" کی ہوتی ہے، شخصیت کے اثر کی نہیں ہوتی۔ جامعہ کا کام سیٹھ جمال محمد مرحوم کے عطیہ اور حیدر آباد کی گرانٹ کی بدولت چلا۔ عطیہ اس تعلق کی وجہ سے دیا گیا جو سیٹھ صاحب کو حکیم صاحب مرحوم سے تھا۔ حیدر آباد کی گرانٹ منظور کرانا اور ایک مرتبہ بند ہو جانے کے بعد پھر جاری کرانا تنہا ذاکر صاحب کا کام تھا۔ اس کے بعد بھی جو بڑی رقمیں ملیں وہ بھی انھیں کے اثر، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی کی بدولت ملیں۔ اس معاملے میں بھی شخص اور موقع کا انتخاب انھوں نے اپنی صواب دید کے مطابق کیا، اور جامعہ والوں کی یہ شکایت سنتے رہے کہ وہ چاہیں تو بہت روپیہ جمع کر سکتے ہیں، نہ معلوم کیوں نہیں کرتے۔

دراصل اس میں جامعہ والوں کا ہی قصور نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کا کچھ ایسا اثر تھا، مشوروں اور بحثوں میں وہ اس طرح حاوی رہتے کہ سب کا میلان خود بخود اس طرف ہو گیا کہ ہر مشکل کو حل کرنے کا اہل اور اس لئے اس کا ذمہ دار انھیں کو بنا دیں۔ جب رفتہ رفتہ جامعہ کے اپنے مفاد کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ایسے کاموں میں لگیں جو جامعہ کے کام نہیں کہے جا سکتے تھے تو ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ ذاکر صاحب کو علی گڑھ کے معاملات سے دلچسپی تھی، اس کی وجہ سے ان کے خاص لوگوں سے تعلقات بڑھے اور ان کی مصلحت اندیشی، حاضر جوابی اور ذاتی اوصاف کا ایسے حلقوں میں چرچا ہوا جہاں شاید جامعہ کا کسی اور سلسلے سے ذکر نہ آتا۔ ۳۴ء میں وہ استادوں کی ایک کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور ان کے خطبۂ صدارت نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ان سے ملاقات کرنے اور ان سے تقریروں کی فرمائشیں کرنے والوں کی تعداد

بہت بڑھنے لگی۔ اکتوبر ۳۷ء میں وردھا میں وہ کانفرنس ہوئی جس میں مہاتما گاندھی نے بنیادی قومی تعلیم کی تجویز پیش کی۔ ذاکر صاحب بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور ان کے جوہر دیکھ کر مہاتما جی نے تجویز کو مرتب شکل دینے کا کام ان کے سپرد کیا اور پھر انھیں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا صدر بنا دیا۔ بنیادی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب ان تمام صوبوں میں بلائے جانے لگے جہاں حکومت کانگریسی تھی اور بنیادی تعلیم کا کسی شکل میں تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ اسی زمانے میں مسلم لیگ نے کانگریس کی مخالفت کے ساتھ بنیادی تعلیم کی بھی مخالفت شروع کر دی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس سے ظاہر ہے ذاکر صاحب الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ کچھ لوگ جامعہ سے اس بنا پر خفا ہو گئے کہ ذاکر صاحب شیخ الجامعہ تھے اور بنیادی تعلیم کا پرچار بھی کر رہے تھے، لیکن مصلحت اندیشی کا یہ کمال تھا کہ جامعہ سیاسی عداوتوں کی لپیٹ میں نہیں آئی، اور مدرسہ ابتدائی میں، جس پر شبہ کیا جا سکتا تھا کہ بنیادی تعلیم کا نمونہ بن گیا ہے، طالب علموں کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہ البتہ تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ جامعہ نے مدرسہ ابتدائی میں بنیادی تعلیم کا تجربہ نہیں کیا، صرف بنیادی تعلیم کے استادوں کی تربیت کے لئے استادوں کا مدرسہ قائم کیا۔ دراصل اب قوم کے لیڈر، جن کا یہ ایک عقیدہ ہو گیا تھا کہ بنیادی تعلیم ہی سچی تعلیم کہلانے کی مستحق ہے ذاکر صاحب کو اتنی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی نگرانی میں یک سوئی کے ساتھ تجربے کرائیں اور جامعہ والے بنیادی تعلیم کے اصولوں کو اس طرح سمجھ نہ سکے تھے کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی کے بغیر کامیابی کے ساتھ بنیادی تعلیم کے طریقے کو اختیار کریں۔

مسلمانوں میں بنیادی تعلیم کی جو مخالفت ہو رہی تھی اس سے جامعہ کو کوئی خاص صدمہ اس وجہ سے نہیں پہنچا کہ مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی نے اسی زمانے میں بالغوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اس کے ابتدائی منصوبوں میں سے ایک یہ تھا کہ قرآن کی آیتیں اور مشہور حدیثیں ترجمے کے ساتھ پوسٹروں کی شکل میں شایع کی جائیں۔ یہ منصوبہ بہت کامیاب ہوا، اس لئے کہ اس کا رسمی مذہب سے قریبی تعلق تھا، مگر مسلمانوں کو جو غلط فہمیاں بنیادی

تعلیم کے بارے میں تھیں وہ بھی قائم رہیں، اور اس ملت میں جس کی کسی زمانے میں ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ اس میں دستکاری کا ہنر جاننے والے کی بڑی قدر تھی ایسے طریق کار کو برا سمجھا جاتا رہا جس کی بنیاد اور جان دستکاری تھی۔ لیکن ملک بھی بنیادی تعلیم کی اسکیم سے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھا سکا۔ مہاتما جی کو ایک طرف بنیادی تعلیم کا نصاب تیار کرانے کی اتنی جلدی تھی کہ جو نصاب تیار ہوا اس میں خامیاں رہ گئیں، اور دوسری طرف وہ سوت کی کتائی کو اتنی اہمیت دیتے رہے کہ باقی تمام حرفے نظر انداز کر دیے گئے، اگرچہ رسمی طور پر ان کا ذکر ہوتا رہا۔ خود ذاکر صاحب نے بعد کے خطبات میں "کام" کی جو تعریف کی، اس کے جو اصول بتائے، اور جس طرح اس حقیقت کی وضاحت کی کہ تہذیبی قدریں "کام" کے ذریعے ایک نسل سے دوسری میں منتقل ہوتی ہیں وہ بنیادی تعلیم کی رپورٹ اور نصاب میں نہیں پائی جاتی، اور اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ نصاب کو مرتب کرنے والے ذاکر صاحب کے خیالات کو سمجھ نہ سکے تھے۔ جامعہ والوں نے ان اعتراضات سے جو بنیادی تعلیم پر کیے جا رہے تھے اتنا اثر لیا کہ اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا ایک طریقہ جو قومی زندگی کی تعمیر میں بہت مددگار ہو سکتا تھا ایک سرکاری ڈھونگ بن کر رہ گیا۔

جنگ کے زمانے میں برطانوی حکومت ایک طرف ہر ایسی تحریک اور ہر ایسے شخص کو بے ضرر کر دینا چاہتی تھی جس سے جنگ کی کارروائیوں میں خلل پڑ سکتا تھا اور دوسری طرف، خاص طور سے ۱۹۴۲ کے بعد، اس الزام سے بچنا چاہتی تھی کہ اسے ہندوستان کی بہبودی سے کوئی مطلب نہیں۔ اسی سلسلے میں تعلیم کے محکمے کی حیثیت بدلی اور بڑھائی گئی، اور یہ ایک بہت قابل اور مخلص ماہر تعلیم جون سارجنٹ کے سپرد کیا گیا۔ سارجنٹ کی تحریک پر جامعہ کی طرف سے درخواست بھیجی گئی کہ اس کی سندیں تسلیم کر لی جائیں، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سرکاری کمیٹی نے جامعہ کا معائنہ کرنے کے بعد سفارش کی کہ جامعہ کی تمام سندوں کو تسلیم کر لیا جائے۔ جامعہ میں اس وقت تک تعلیم کے میدان میں صرف مدرسہ ابتدائی نے امتیاز حاصل کیا تھا، اور

بنیادی تعلیم کے لئے استاد تیار کرنے میں استادوں کے مدرسے نے، حکومت کی طرف سے جو دو سندیں تسلیم کی گئیں اس سے سمجھنا چاہئے کہ ذاکر صاحب کی تعلیمی خدمات کا اعتراف مقصود تھا۔ اسی زمانہ میں جامعہ کے جشن سیمیں کو اہتمام سے منانے کا ارادہ کیا گیا اور موقع سے فائدہ اٹھاکر جامعہ کی توسیع کے لئے روپیہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔ اس سلسلے میں جتنی بڑی رقمیں وصول ہوئیں وہ جامعہ کو نہیں بلکہ ذاکر صاحب کو دی گئیں۔ ذاکر صاحب ہی اس کا حوصلہ کر سکتے تھے کہ جامعہ کے جشن سیمیں کو قومی ہم آہنگی کا یادگار واقعہ بنائیں جب کہ شمالی ہندوستان میں دشمنی اور کشت و خون کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ ان کی کوشش سے جشن سیمیں کے موقع پر کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور سب نے جامعہ کی قومی اور تعلیمی حیثیت کا اعتراف کیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت نے اس سے بڑھ کر کوئی اور کرشمہ نہیں دکھایا، اور یہ ہمت اور حکمت عملی کا ایک کارنامہ تھا جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

جامعہ نے اپنے تعلیمی کاموں کے سلسلے میں آس پاس کے تمام گانوں کے لوگوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے تھے، اور اس کا اندیشہ کم تھا کہ قتل و غارت کی وبا سے اثر لے کر یہ لوگ جامعہ پر حملہ کریں گے۔ لیکن فساد کرنے والے باہر کے لوگ تھے، اور اگرچہ جامعہ پر براہ راست حملہ نہیں ہوا تھا، یہاں اتنے مسلمان گانوں سے بھاگ بھاگ کر پناہ گزیں ہوئے تھے کہ حالت بہت خطرناک ہو گئی۔ اس وقت وہ محبت جو مہاتما جی کو ذاکر صاحب اور جامعہ سے تھی کام آئی۔ ۸ر ستمبر کو جب وہ دلی پہنچے تو سب سے پہلے انھوں نے ذاکر صاحب اور جامعہ کی خیریت دریافت کی، اور دوسرے دن خود حالات معلوم کرنے کے لئے تشریف لائے۔ ان کی اس توجہ نے حکومت کو بھی اپنے فرض کا احساس دلایا، وزیر صحت، وزیر اعظم، کمانڈر ان چیف سب آئے اور حال دیکھ گئے، اور کمانڈر ان چیف نے ایک فوجی دستہ جامعہ والوں کی حفاظت کے لئے تعینات کر دیا۔ اس احسان کو ذاکر صاحب نے اس طرح اتارا کہ ۱۰ر جنوری کو ۱۹۴۸ء میں ایک جلسہ کرایا جس میں رفوجی اور مسلمان اپنے بچوں کو ساتھ لے کر آئے، بڑے آپس میں

گلے ملے، بچوں نے ساتھ کھیلا اور مٹھائی کھائی۔

جامعہ میں ذاکر صاحب کے آخری دو سال افسردگی اور مایوسی میں گذرے۔ جشن سیمیں کے بعد جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونا چاہئے تھا، مگر ایک طرف ملک میں فساد کی آگ بھڑکتی اور پھیلتی رہی، اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے بجھانا درکنار اس کے شعلوں کی لپک کو کم کرنا بھی کسی کے بس میں نہیں ہے، دوسری طرف، سوائے سماجی تعلیم کے اس کام کے جو مرحوم شفیق صاحب شہر میں کر رہے تھے اور کتابوں کی اشاعت کے جو منصوبے مرحوم حامد علی خاں نے بنائے تھے، جامعہ والوں میں نئے ولولوں اور حوصلوں کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ معمول کا کام، معمول کے جھگڑے، چھوٹی سی دنیا کے حقیر ہنگامے، وہی جن سے پیچھا چھڑانے کے لئے جشن سیمیں کا اہتمام کیا گیا تھا، گلے کا طوق بنے رہے۔ ذاکر صاحب کی صحت بھی خراب ہوتی جارہی تھی، اور اس کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرتا تھا۔ انھیں شاید سب سے زیادہ دکھ اس کا تھا کہ حکومت ہند، اگرچہ ایک آزاد ملک کی حکومت تھی، پرانے قاعدوں کی غلامی اپنا حصہ سمجھتی رہی۔ ذاکر صاحب حیدر آباد میں امداد مانگنے گئے تو سر مرزا اسمٰعیل نے انھیں لنچ کی دعوت دی، اور کھانے کے بعد پانچ لاکھ کا چک بطور عطیہ پیش کر دیا۔ سر مرزا اسمٰعیل غالباً جامعہ سے واقف بھی نہ تھے، صرف ذاکر صاحب سے ملے تھے۔ حکومت ہند کے رہنما جامعہ سے اور اس کے کاموں سے واقف تھے، ذاکر صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے اور بظاہر ان کی بہت قدر کرتے تھے، لیکن انھوں نے عطیہ کے طور پر چار لاکھ نوے ہزار کی جو رقم دی اس کے لئے حسب قاعدہ پیروی کرنے کی ضرورت پڑی۔ اس کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ حکومت اپنا فرض ادا کر چکی ہے، اب جامعہ کو سالانہ خرچ کے لئے جو کچھ ملے گا وہ سرکاری قاعدے کے مطابق اور تمام شرطیں پوری کرنے کے بعد ملے گا۔ سرکاری قاعدہ وہی تھا جو برطانوی حکومت کے زمانے میں، اس لئے درخواستیں دینے اور ان کی پیروی کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور آخر میں ذاکر صاحب نے کہدیا کہ جس کو مانگنا ہو وہ مانگے، اب میں کسی درخواست پر دستخط نہ کروں گا۔

ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ۴۸ء کے آخر میں علی گڑھ چلے گئے۔ آدمی کو انھیں خطروں کا علم ہوتا ہے جو اسے پیش آتے ہیں، مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ جو خطرے پیش نہیں آئے انھیں بھی ذہن میں رکھا جائے۔ جامعہ کے بند ہو جانے کا خطرہ تھا، اس کا خطرہ تھا کہ اس کے سارے منصوبے دلوں کا سرور بن کر رہ جائیں گے، جامعہ لاوارث ہو سکتی تھی، ایک یتیم ادارہ جس کے چلانے والے دربدر پھرتے اور خیرات کے بدلے دعائیں دیتے۔ لیکن جامعہ، اس ابتدائی مذہبی جوش میں جو اس کے قیام کے زمانے میں پھیلا ہوا تھا ایسا ادارہ بھی بن سکتی تھی جس کا مذہب بدلتے بدلتے مولانا محمد علی مرحوم کی سیاست کا رنگ اختیار کر لیتا، یا وہ قومی تعلیم کی ایسی مثال بن سکتی تھی جو نہ مسلمان کے دل کو لگتی نہ ہندو کے۔ وسائل کی کمی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جامعہ والے اس دنیا کو حقیر اور گمراہ سمجھنے لگیں جو ان کے کام کی اور ان کی قدر نہیں کرتی تھی، خودستائی اور ریاکاری کے فریب میں آجائیں، غریبی کی پابندیوں اور مجبوریوں کو اپنا مذہب بنا لیں۔ ان سب خطروں سے جامعہ کو ذاکر صاحب کی طبیعت نے بچایا، جو صرف آزاد نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے کسی کی گرفت میں نہیں آئی تھی۔ انھوں نے نصیحت نہیں کی، براہ راست رہنمائی نہیں کی، بس عقدہ کشا عقل کا امتحان لیتے رہے، اخلاق اور علم کی ایک مثال بنے رہے جس کا حسن ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا، اور جوہر دیکھنے والے کو اس سوچ میں ڈال دیتی تھی کہ سراب کا جلوہ حقیقت ہے یا حقیقت سراب کا جلوہ۔

شیخ الجامعہ

۱۔ پہلے شیخ الجامعہ ——— مولانا محمد علی ۱۹۲۰——۱۹۲۱

۲۔ دوسرے شیخ الجامعہ ——— عبدالمجید خواجہ ۱۹۲۱——۱۹۲۶

۳۔ تیسرے شیخ الجامعہ ——— ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۲۶——۱۹۴۸

(مذکورہ بالا دونوں شیخ الجامعہ پر امیر جامعہ کے تحت مضامین شائع ہو چکے ہیں۔)

۴۔ چوتھے شیخ الجامعہ ——— پروفیسر محمد مجیب ۱۹۴۸——

(یہ دور ابھی جاری ہے)

پہلے شیخ الجامعہ ــــ مولانا محمد علی

۱۹۲۰ ــــ ۱۹۲۱ء

ڈاکٹر عبدالحمید زبیری

پہلے شیخ الجامعہ ــــــ مولانا محمد علی

۱۹۲۰ء ــــــــــ ۱۹۲۱ء

مولانا محمد علی مرحوم مسلمانان ہند کی ان چند ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر ایک گہرا نقش ثبت کیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاست، شاعری، علم و ادب، صحافت اور تعلیم پر وہ کافی اثر انداز ہوئے ہیں۔ مولانا محمد علی فطرت کے اُن چند منتخب افراد میں سے تھے جنھیں وہ غیر معمولی دل و دماغ کی صلاحیتیں دیتی ہے۔ وہ جس شعبۂ زندگی میں بھی رہے ایک کامیاب انسان رہے اور وہ جہاں بھی رہتے ان کی عظیم الشان شخصیت سب پر حاوی ہوجاتی، لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اُن کا دل اُن کے دماغ پر غالب آتا گیا، حتیٰ کہ ملت اسلامیہ کے عشق میں اُن کی حالت مجنوں کی سی ہوگئی۔ اس جنون کے باعث انھوں نے زمانے سے ایک لڑائی مول لی، وہ حق کے لئے سینہ سپر ہوکر ہر کسی کے خلاف ڈٹ گئے، انتہائی علالت کی حالت میں وہ کشاں کشاں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے، وہاں ہندوستان کی آزادی کا رندانہ نعرہ بلند کیا اور بالآخر عالم اسلام کا یہ عظیم مجاہد بیت المقدس کی روحانی خاک میں ہمیشہ کے لئے مدفون ہوکر اپنے رب کے قریب ہوگیا۔

ہر بڑا انسان اپنے قومی تمدنی ورثہ سے وہ سب کچھ حاصل کرسکتا ہے جو اس میں موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اسلامی تمدن سے اس کے بہترین عناصر کو اخذ کیا۔ ان کی تعلیم مغربی

ماحول میں ہوئی تھی، لیکن انھوں نے اپنے شوق سے قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلامی، علم الکلام وغیرہ جیسے اسلامی علوم پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔ پھر انھوں نے اس تمدنی ورثہ کے اکتساب پر ہی قناعت نہ کی بلکہ اُسے پرکھا اور اس خس و خاشاک کو جو اس میں استدادِ زمانے کے باعث جمع ہو گیا تھا دور کرنے کی کوشش کی۔ مولانا محمد علی نہ صرف جذباتی حیثیت سے بلکہ عقلی غور و فکر کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام انسانیت کی نشو و نما کے لئے سب سے بہترین نسخہ ہے، اسی پر عمل کر کے نہ صرف مسلمانانِ عالم بلکہ تمام دنیا اپنی مادی اور روحانی نجات حاصل کر سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت خلوص اور جوش کے ساتھ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا کی آخری زندگی کی مذہبی کیفیت کو دیکھ کر لوگ انھیں ملّا کہنے لگے تھے، لیکن وہ اس پر فخر کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہی طرزِ فکر اور طرزِ زندگی سب سے بہتر تھا۔ اسلامی تمدن سے وابستگی کے لئے آخری عمر میں انھوں نے عربی لباس بھی اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح مولانا باطنی اور ظاہری دونوں لحاظ سے تمدنِ اسلامی کے بہترین مظہر بن گئے تھے۔

دین و دنیا کی ہم آہنگ نشو و نما

جن اصولوں کی بنیاد پر" تمدنِ انسانی کی بقاء، اصلاح اور نشو و نما چاہتے تھے، ان ہی اصولوں کو وہ انسانی تعلیم کا مقصد قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اس قرآنی دعا کو تعلیم کا مقصد قرار دیا کہ
رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً
دنیا و دین کی فلاح، مادہ اور روح کی ہم آہنگی، جسمانی اور روحانی قویٰ کی نشو و نما چنانچہ تعلیم کا مقصد قرار پایا، لیکن دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ وہ مقصد کلی یعنی دینی مقصد کے ماتحت ہو، جز ہمیشہ کل کا تابع رہے۔ انسان کی ابدی زندگی اس کی مخالف زندگی کے مقصد کو متعین کرے۔ چنانچہ تعلیم کا مقصد ہوا کہ:

از کلید دیں در دنیا کشاد

مذہبی تعلیم کو غرضکہ ہر تعلیم کی اساس ہونا چاہیئے۔ خصوصاً ملت اسلامیہ کی آئندہ نسلوں کی تعلیم تو روحانی اساس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

لیکن مذہبیت اور روحانیت کے معنی ترک دنیا کے نہیں ہیں بلکہ یہ ہیں کہ اس روح کو بہتر طریقہ پر دنیاوی امور میں کارفرما کیا جائے چنانچہ دنیاوی امور کی تعلیم ضروری ہے۔ خاندانی، وطنی، ملی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کا احساس تعلیم کا لازمی جزو ہونا چاہیئے۔

اس کے ساتھ ہی انفرادی مادی زندگی کی بقا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ معاش کا مسئلہ تعلیم میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کسب حلال انسان کے لئے ضروری ہے اور تعلیم کا یہ مقصد بھی ہونا چاہیئے کہ وہ طالب علموں کو اس کے لئے تیار کرے۔

مولانا محمد علی محدود معنی میں ایک مدرس نہ تھے، لیکن وہ ایک عظیم الشان مفکر تھے، اس لئے ایک انسانی معلم بھی تھے۔ ان کے پیش نظر انسانی تعلیم کے یہ تینوں ضروری عناصر موجود تھے۔ انھوں نے شروع میں کوشش کی کہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، جہاں کی وہ تخلیق تھے اور جس سے انھیں بے انتہا محبت تھی، ان مقاصد تعلیم کو قبول کرے اور ان کی روشنی میں خود کی زندگی میں انقلاب پیدا کرے۔ لیکن رجعت پسند طاقتوں کے مقابلے میں انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی، چنانچہ بالآخر ایک نئی اسلامی جامعہ کا مولانا شیخ الہند مرحوم کے ہاتھوں علی گڑھ کی جامع مسجد میں افتتاح کرایا گیا اور اس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذریعہ مولانا محمد علی مرحوم اور دیگر اکابر اسلام مسلمانان ہند کا ملی اور اسلامی احیا چاہتے تھے چنانچہ شروع ہی میں ان مقاصد کو نہ صرف مولانا محمد علی مرحوم نے بلکہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے واضح کر دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مقاصد

چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم ہمدرد کے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"جامعہ کا ہمیشہ سے ایک خاص معین مقصد ہے اور وہ خود اس قدر جامع اور صاف ہے کہ اس کی تشریح و تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ جامعہ نے ابتدا ہی سے اپنے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرور ہندوستانی پیدا ہوں۔"

مولانا مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

"جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا اور تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمے لیا اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا، خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی اس کی مثال مثل الحمار ہو جائے، اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست اور حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے۔"

فطری نشو و نما کا اصول

مولانا محمد علی کو اس کا پورا احساس تھا کہ تعلیم کا مقصد انسانی ذہن میں اشیا کے علم کا ٹھونسنا نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی داخلی، امکانی قویٰ کی بتدریج نشو و نما ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

"نباتات اور انسان جمادات کی طرح غیر ذی روح نہیں ہیں، جس کا ارتقار خارجی ہوتا ہے یعنی ترقی نہیں ہوتی، محض ازدیاد یا بڑھوتری ممکن ہے۔ خلاق عالم نے نباتات اور حیوانات میں خود نمو کا انتظام فرما دیا ہے اور داخلی ترقی کا سامان خود ان میں فراہم کر دیا ہے۔"

اس بنا پر مولانا مرحوم طلبا میں جامد تقلید کا مادہ پیدا نہ کرنا چاہتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ وہ خود قرآن اور حدیث کا علم حاصل کریں اور اسلام کے روحانی سرچشموں سے خود بلا واسطہ فیضیاب ہوں، وہ تقلید جامد کو مسلمانوں کے ذہنی اور علمی زوال کا سبب خیال کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دلا کر ان کو اس ذہنی غلامی سے نجات دلانے کے قائل تھے۔

اسلام کی تعلیمات کو مولانا چونکہ تمام تعلیم انسانی کی اساس سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب میں اسلامی مذہبی تعلیم کو اساس قرار دیا اور قرآن و حدیث، ضروری فقہ

اور قدرے عربی زبان کی تعلیم کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر جامعہ کی اعلیٰ تعلیم تک ایک لازمی مضمون قرار دیا۔

سائنس اور پیشہ کی تعلیم کی ضرورت

جامعہ کے تعلیمی نصاب میں مولانا نے دنیاوی ضروریات کے لئے دیگر مضامین کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھا، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"جامعہ کی تعلیم میں دوسری طرف مسلمانوں کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان یا تو مسجد کے ملا ہوتے تھے یا سرکاری دفتر کے کلرک۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے تلامذہ حصہ لے سکیں اور دنیا کا کوئی دروازہ ان پر بند نہ ہو۔ ادب اور تاریخ، فلسفہ اور سائنس کے ذریعہ وہ سارے عالم کو اپنا جولانگاہ بنا سکیں۔"

جامعہ کی تعلیم کا مقصد مسلمان طلبا کو اپنی روزی کمانے کے لائق بھی بنانا ہے، چنانچہ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"طلبا نے مذہبی تعلیم حاصل کرلی، ذہنی اور دماغی نشوونما بھی ہوگیا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش نظر رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی روزی خالص دماغی کام کے ذریعہ ہی سے کمانے پر مجبور نہ ہوں۔ کوئی پیشہ ایسا بھی اختیار کرسکیں جس میں محض جسمانی محنت سے روزی کمائی جا سکے اور جس میں بڑے سرمایے کی حاجت نہ ہو، مثلاً نجاری، قفل سازی، پارچہ بافی وغیرہ۔"

غرضیکہ مولانا محمد علی مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلیمی نصب العین کو جن عناصر سے ترکیب دیا تھا، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور اس سے وابستہ مذہبی علوم کی تعلیم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم۔

(۲) آزادیٔ وطن کے پاک جذبے کی تربیت اور نشوونما۔

(۳) علوم وفنون، تاریخ، فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی تعلیم۔

(۴) معاش کے لئے ضروری فن کی تعلیم۔

مادری زبان میں تعلیم

مولانا طالب علموں کی اچھی تعلیم کے لئے یہ ضروری خیال کرتے تھے کہ ذریعۂ تعلیم ابتدائی جماعتوں سے لے کر اعلیٰ جماعتوں تک مادری زبان ہو، چنانچہ وہ اس مسئلے پر نہایت جوش سے لکھتے ہیں کہ

"ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں، لیکن خود تہذیب یافتہ مغربیوں کا کیا شعار ہے؟ کیا کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ یا سائنس فرانسیسی یا جرمن زبان میں پڑھاتا ہے، کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی، انگریزی یا روسی زبان میں سکھاتا ہے؟ لیکن ہماری غلامی اور اب ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکول اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے ہیں جس طرح کہ انگریز جانتے ہیں، ہندوستانی بچوں کو تاریخ اور سائنس، جغرافیہ اور ریاضی، انگریزی زبان میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

مولانا نے شروع ہی سے اردو کو جامعہ کے تمام درجوں میں ذریعۂ تعلیم قرار دیا، چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ کے طلبا نے بہتر طریقہ پر مضامین کو اخذ بھی کیا اور اس تعلیم کے لئے ان کو وقت بھی نسبتاً کم صرف کرنا پڑا۔

نظریہ اور عمل

مولانا محمد علی ایک انتہائی باعمل انسان تھے۔ چنانچہ صرف نظریوں سے انھیں دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ تعلیم میں بجا طور پر عمل پر زور دیتے تھے۔ اخلاقی تعلیم کا بہترین طریقہ یہ نہیں ہے کہ اخلاقی خوبیوں پر وعظ

کے بجائیں بلکہ اساتذہ خود ان اخلاقی اوصاف سے متصف ہوں، وہ اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی سے مدرسے کے ماحول کو اخلاقی اور روحانی بنا دیں تاکہ اس ماحول میں زندگی گذارنے ہی سے طلبا، با اخلاق خدا پرست، ملت پرور اور وطن دوست ہو جائیں۔ مولانا محمد علی کی خود زندگی سراپا عمل تھی، وہ خود بذاتہ ان تمام خوبیوں کے بدرجۂ اتم حامل تھے، جو وہ اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جس کسی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا وہ خود بہت حد تک ان خوبیوں کا حامل ہو گیا۔

اُن ہی کی تربیت یافتہ ایک جماعت نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسلام کی صحیح روح پھونکی، اور اہل ملک کو جہاد آزادی کے لئے آمادہ کیا، انھوں نے علی گڑھ کے فیشن پرستوں کو موٹے گاڑھے کا عادی بنا دیا، مذہب اور آزادی کے لئے ہر قسم کی مالی اور جانی قربانی کا جذبہ انھوں نے اپنے ساتھیوں میں بدرجۂ اتم پیدا کر دیا، ان ہی کی تربیت یافتہ دوسری جماعت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بقاء اور نشوونما کے کام کو اپنے ذمے لے لیا اور بالآخر اس کو مسلمانوں کی ایک عظیم الشان درسگاہ بنا دیا۔

مولانا محمد علی آخر عمر میں اپنے دیگر ملی اور قومی کاموں کے باعث جامعہ ملیہ اسلامیہ کے روزمرہ کے کاموں میں حصہ نہ لے سکے اور ان کے جیسے عظیم مفکر وسیع الخیال اور وسیع العزم سیاستداں کے لئے یہ ممکن بھی نہ تھا کہ وہ صرف خود کو ایک تعلیمی درسگاہ میں محدود کر دیتا۔ ان کی جولانگاہ وسیع تھی ان کو نہ صرف ہندستان کے کروڑوں مسلمانوں کی قیادت کا فرض ادا کرنا تھا بلکہ غیر مسلموں کی بھی جہاد آزادی میں راہ نمائی کرنی تھی۔ وہ ان فرائض کو آخر وقت تک نہایت جانسوزی، بے باکی اور خلوص سے انجام دیتے رہے، حتیٰ کہ انھیں فرائض کی ادائیگی نے ان کی صحت کو تباہ کر دیا اور بالآخر وہ غم قوم و ملت میں گھُل گھُل کر شہید ہو گئے۔ خدا ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

انھوں نے دنیا کو سبق دیا کہ تعلیم اصل معنی عمل ہے، سوز زندگی ہے، عشق ملت اور انسانیت ہے۔ وہ اس شعر کی زندہ تفسیر تھے:

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے　　دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

مولانا محمد علی مرحوم انسانیت کے لئے عمل کا سب سے بہتر نمونہ حضور اکرم صلعم کی ذات بابرکات کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایمان راسخ تھا کہ صحیح تعلیم وہ ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے اور صحیح اسوۂ حسنہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ کا اسوہ ہے، چنانچہ ان کا ایک شعر ہے:

ہو محمد کیوں نہ قرآں اور بھی ہم کو عزیز
اس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے

(جوہر)

مولانا محمد علی نے مغربی تہذیب و تمدن کی گود میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اپنی ذہانت اور طباعی سے اسلامی تمدن اور تعلیم کی تہہ تک پہنچ گئے اور بالآخر اسے انھوں نے تمام دنیا کے لئے بہترین تعلیمی نسخہ قرار دیا۔ ان میں احساسِ کمتری نام کو بھی نہ تھا بلکہ انھیں اپنی ملی روایات پر فخر تھا۔ وہ ایک بہادر انسان تھے، اس لئے بہادروں جیسی زندگی انھوں نے گذاری۔ وہ مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود اور اس کی بقا اور نشو ونما کے قائل تھے چنانچہ تمام عمر اس کے لئے جدوجہد کی لیکن وہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے بھی مخالف نہ تھے بلکہ چاہتے تھے کہ جہادِ آزادی میں ہم سفر ہوں۔

غرضکہ مولانا محمد علی نے اپنی تحریر و تقریر اور اپنے عمل سے اور مسلمانانِ ہند کے سامنے نہ صرف ایک صحیح تمدنی و تعلیمی نصب العین پیش کیا بلکہ اپنی اخلاقی خوبیوں اور مسلسل قربانیوں سے اس نصب العین کو ایک زندگی بھی بخش دی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بہت حد تک ان خوبیوں کو باقی رکھا ہے۔

چند مرحوم اساتذہ

۱۔	آپا جان ــــ مس گرڈا فلپس بورن	تاریخ وفات	۱۴ر اپریل ۴۳ ۱۹ء
۲۔	شفیق الرحمٰن قدوائی	〃	۲ر اپریل ۱۹۵۳ء
۳۔	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	〃	۲۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء
۴۔	حامد علی خاں	〃	۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء
۵۔	اختر حسن فاروقی	〃	۱۵ر جولائی ۱۹۶۵ء

پروفیسر محمد مجیب

آپا جان ــــــ مِس گرڈا فلپس بورن

جہاں تک مجھے یاد ہے مس فلپس بورن سے ذاکر صاحب، عابد صاحب کی اور میری پہلی ملاقات ایک دعوت میں ہوئی، جو برلن میں مسز نائیڈو کی سب سے چھوٹی بہن مسز نمبیار کے مکان پر ہوئی تھی۔ یہ دعوت کھانے پینے کی نہیں تھی، اس کا مقصد ہندوستانیوں اور مہذب خوش اخلاق جرمنوں کے درمیان میل جول کے موقعے فراہم کرنا تھا۔ دعوت کی تاریخ کیا یاد رہتی سال کا بھی خیال نہیں، غالباً ۲۴ء تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد دو ایک مرتبہ اور ایسی محفلوں میں ملنا ہوا، پھر مسز نمبیار کسی بات پر خفا ہو گئیں اور دعوتوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔

گھر پر ایک روز ذاکر صاحب نے باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ "جب سے وہ دعوتیں بند ہو گئی ہیں نئے لوگوں سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی" شائد انھیں اس معاملے کے بارے میں بہت کچھ معلوم تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

"شائد لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا معقول لوگوں سے ملنا انھیں کی عنایت سے ہو سکتا ہے۔"

"پھر کچھ کیجئے نا؟"

"کیا کروں؟"

"مس فلپس بورن ہی کو ٹیلیفون کیجئے۔"

"آپ نے اچھا یاد دلایا ابھی کرتا ہوں۔"

ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی تو میں پاس کھڑا تھا، چاء کی دعوت ہیں، میں بھی بلایا گیا۔ ہم لوگ

پہنچے تو مس فلپس بورن گھر پر نہیں تھیں، ماں باپ پریشان تھے، انھیں نئے زمانے کا یہ طریقہ بالکل پسند نہ تھا کہ مہمان آجائیں اور میزبان گھر پر موجود نہ ہو، لیکن وہ اس ذراسی بات کی کیا شکایت کرتے، جب نئے زمانے کی لڑکیاں خود مختاری کا دم بھر رہی تھیں، گھریلو زندگی بسر کرنے اور شادی کرنے سے انکار کر رہی تھیں، جس سے جی چاہتا ملتیں، جہاں جی چاہتا جاتیں، جب جی چاہتا گھر واپس آتیں، نہ کھانے کی فکر کرتیں نہ کپڑے کی، نہ انھیں اس کی پروا ہوتی کہ ماں باپ کا سایہ سر پہ نہ رہے گا تو کیا کریں گی۔ مس فلپس بورن کی بڑی بہن ڈاکٹر کارل مائیر دق کے ایک ماہر کے یہاں کام کرتی تھیں۔ میں ڈاکٹر مائیر سے اپنا معائنہ کرانے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر اس طرح مسکرائیں گویا برسوں سے جانتی ہیں۔ انھیں سے معلوم ہوا کہ مس فلپس بورن کی بڑی بہن ہیں۔ اس کے بعد پھر کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی اور ہوتی کیسے وہ کسی کام، کسی مقام کی پابند نہ تھیں۔ ڈاکٹر مائیر کے یہاں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد وہ جرمنی سے چلی گئیں۔ چند سال ہسپانیہ میں گذارے اب شاید جنوبی امریکہ میں ہیں۔ ماں باپ کو جو ذرا تسلی رہی وہ چھوٹی لڑکی کی ذات سے۔ انھوں نے ایک خوش حال تاجر سے شادی کی تھی ان کا گھر بار تھا، بچے تھے، اطمینان سے زندگی بسر ہوتی تھی، یہ اور بات ہے کہ قسمت نے ان کے گھر کو بڑی بے دردی سے اجاڑا، اُن کی دولت لٹ گئی اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ آسٹریلیا میں ہیں، ان کے بچے متحدہ ریاستوں میں دوسرے عزیزوں کے ساتھ۔ مس فلپس بورن کے ماں باپ کے آخری دن بڑی مصیبت میں گزرے، ان پر ایک طرف نازی حکومت کی مار پڑ رہی تھی، دوسری طرف اولاد سے جدائی کا صدمہ تھا۔

مس فلپس بورن اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور ہنر مند تھیں، ان کی طبیعت میں ویسی ہی بے قراری تھی جیسی کہ بڑی بہن میں، لیکن ہنر کا سہارا ملنا بڑی بات ہے۔ انھیں یقین تھا کہ جو کچھ کرنا چاہیں گی وہ کرسکیں گی۔ مہذب لوگوں میں ان کی قدر رہے گی۔ انھوں نے میونخ کے مشہور اسکول میں گانا سیکھا تھا، وہ اس فن کو جسے جرمنی میں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، برتتی رہتیں تو خاصی مشہور ہو جاتیں، ان کی معقول آمدنی ہوتی اور وہ اپنی زندگی

آرام سے گذارتیں، لیکن اطمینان سے رہنا انھیں گوارا نہ تھا، شاید اسی لئے انھوں نے خاندانی زندگی کی پابندیاں قبول نہیں کیں۔ وہ ایسا کرتیں تو شاید ان جذبات کو جنھیں قدرت نے عورت کے حصے میں رکھا ہے معمولی طریقے پر تسلی ہو جاتی، لیکن معمولی طریقوں کو پسند نہ کرنے سے قدرت کا نظام نہیں بدل جاتا۔ دنیا کو مرد نے بنایا ہے تو اس کی پرورش عورت کی گود میں ہوئی ہے اور سچی عورت کو تسلی نصیب ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ نسوانیت کے عالمگیر منصوبے میں کسی نہ کسی طرح سے شریک نہ ہو۔ مس فلپس بورن کی حساس اور قدر شناس طبیعت پرورش اور پرداخت کے کسی ادنیٰ منصوبے کو عمر بھر کے لئے کافی نہیں سمجھ سکتی تھی، انھوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کی رنج اور پریشانیاں، فکریں اور الجھنیں، امیدیں اور حوصلے اپنا لئے، کیونکہ یہ لوگ ایسی ہمدردی کے مستحق معلوم ہوتے تھے۔ اس سے کہیں بڑھ کر یہ بات تھی کہ ان کے دل میں پرورش کرنے کا جو جذبہ تھا وہ انھیں غیر شخصی مقاصد میں مصروف اور محور کھ سکتا تھا اور یہ ایک خصوصیت تھی جس نے ان کی اعلیٰ طبیعت کو اعلیٰ تر بنا دیا۔ برلن میں لاوارث یہودی بچوں کے لئے ایک تربیت گاہ قائم کرنا تجویز ہوا، مس فلپس بورن خوشی سے اچھل پڑیں اور ایک مدت تک اس تربیت گاہ کے سوا اور کسی چیز کا خیال ان کے دل میں نہ آیا۔ اس کے لئے انھوں نے چندہ جمع کیا، گھر گھر مانگ کر اس کے لئے ضروری سامان اکٹھا کیا اور سامان کو مزدوروں کی طرح برلن کی سڑکوں پر ٹھیلوں میں لے گئیں۔ تربیت گاہ کا کوئی سرپرست نہ تھا، مس فلپس بورن اس کی والی وارث بن گئیں۔ ہندوستان آتے ہوئے وہ چند مہینے فلسطین میں ٹھہری تھیں۔ یہاں کا سارا کام شروع سے شروع کیا جا رہا تھا اور اس سے ان کو ایک لگاؤ ہو گیا جو جامعہ کی محبت کے باوجود قائم رہا۔ جامعہ کی بے سروسامانی نے ان کی ہمت پست کرنے کی بجائے ان کے شوق کو دوبالا کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جامعہ والوں کے حوصلے بڑھتے رہے، روپیہ ملتا رہا، عمارتیں بنیں، لیکن بے سروسامانی کا احساس بھی پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہوتا گیا۔ مس فلپس بورن صفر سے عدد بناتی رہیں، ان کا سلیقہ ہماری مفلسی میں رونق پیدا کرتا رہا، جامعہ کی خدمت ان

کی زندگی کا آخری منصوبہ تھا اور اس میں اس طرح لگ گئیں کہ اب کوئی ان کو اس سے الگ نہیں کر سکتا ۔

مس فلپس بورن کو سب سے زیادہ مرغوب وہ کام تھے جو نئے ہوں، مشکل ہوں، جنھیں کرنے والے کم ہوں مگر جو انسانیت یا اخلاق کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہوں ۔ لوگ ایسے کاموں کی ذمہ داری لینے سے بچتے ہیں اس لئے کہ اس میں جان کھپانا پڑتی ہے اور ان سے روحانی تسکین کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مس فلپس بورن کے لئے ان کی سب سے بڑی کشش یہی تھی ۔ یورپ میں ایسے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں اور کئے جاتے ہیں ، لیکن وہاں قومی مقاصد افراد اور چھوٹی جماعتوں کے مقاصد پر اس طرح چھا گئے ہیں ، زندگی کا دھارا اتنی تیزی سے بہتا ہے ، افراد کی شخصیتیں ، ریاست کی ہمہ گیر شخصیت میں اس طرح گم ہوگئی ہیں کہ جب تک قومیت کا جذبہ انھیں سہارا نہ دے اور تقویت نہ پہنچائے افراد اور چھوٹی جماعتیں سماجی خدمت کے کام کرنے کے لائق معلوم ہی نہیں ہوتے ۔ ہم سب اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں آخر کیوں کرتے ہیں اور اگر ہم اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکیں تو ہمارا جی چھوٹ جاتا ہے ۔ یورپ میں خدا کی خدمت نہیں کی جا سکتی ، کیونکہ وہ لوگ جو سماجی کاموں کو پرکھتے ہیں اور جن کی ہمت افزائی شوق کو بڑھاتی ہے ، خدا کو جانتے ہوں ، تب بھی مانتے نہیں ۔ خلق کی خدمت کی جا سکتی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ خلق اپنی قوم ہی ہو ۔ مس فلپس بورن یہودی تھیں ۔ جرمن قوم ان کی قوم بن نہیں سکتی تھی ، یہودیوں کو ایک قوم بنانا خدا کو منظور نہیں ، وہ کرتیں تو کیا کرتیں ۔ اس سات سال کی مدت میں جو ہماری پہلی ملاقات اور ان کے جامعہ آنے کے درمیان گزری ، یورپی زندگی سے ان کا رشتہ کمزور ہوتا گیا ۔ ان کا دل آزاد تھا کہ جہاں چاہتا اپنا ٹھکانا بنا سکتا تھا ۔ جامعہ میں آکر وہ جامعہ کی ہو گئیں ۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا ملک مسلمانوں کو اپنی قوم اور یہودی ہوتے ہوئے اسلام کو اپنا مذہب بنا لیا ۔ اس طرح جامعہ کو ایک بے لوث خادم مل گیا اور مس فلپس بورن کو اپنے حوصلے پورے کرنے کے لئے ایک دنیا جو نئی تھی اور

ان کی اپنی تھی۔

مس فلپس بورن نے اپنے طریقہ پر جامعہ کی خدمت اسی زمانے میں شروع کر دی تھی جب کہ ہم لوگ برلن میں تھے، انھیں ہمارے ہر کام سے اور ہر شوق سے دلچسپی تھی، ہماری ذات سے لگاؤ تھا جیسے کسی بہن کو ہو سکتا ہے جو دوست بھی ہو اس وقت میرے کئی مشغلے تھے جنھیں یاد کرکے اب ہنسی آتی ہے لیکن ان کی وجہ سے مس فلپس بورن کو خیال ہوا کہ میں یورپی تہذیب کے لطیف پہلو سے واقف ہوں۔ ذاکر صاحب مجھ سے زیادہ ہی جانتے اور سمجھتے تھے لیکن وہ انجان بننا بھی جانتے تھے۔ وہ بدیہی باتوں کی تردید، پسندیدہ چیزوں کی مذمت، تہذیب اور فن کے مانے ہوئے اصولوں کی مخالفت بڑے دلچسپ انداز اور شاید تفریح کی خاطر کیا کرتے تھے، اس لئے مس فلپس بورن نے ان کے مذاق کو تربیت دینا ضروری سمجھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں مگر اس کا انھیں یقین ہو گیا کہ اگر وہ ہندوستان آئیں اور جامعہ کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تو تہذیب کی اعلیٰ قدریں ان کی نظر سے چھپ نہ جائیں گی۔ آدمیت کو فروغ آدمی سے ہوتا ہے، مقاصد کا اندازہ ان کے خادموں سے کیا جاتا ہے۔ مس فلپس بورن کو ہندوستان نہ کسی کی شخصیت ہی کھینچ کر لائی نہ محض ایک مقصد بلکہ شخصیت اور مقصد کی وہ ہم آہنگی اور مناسبت جو دل میں اعتماد پیدا کرتی ہے اور کامیابی کی امید۔ یہ تو مس فلپس بورن ہی جانتی ہوں گی کہ جرمنی سے انھوں نے ہندوستان آکر کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس کا مجھے یقین ہے کہ وہ کسی کام میں اور کام کرنے والوں کی کسی جماعت میں اس طرح کھپ نہیں سکتی تھیں جیسے کہ جامعہ اور جامعہ کے خادموں میں۔

ہمارے اور ان کے درمیان کسی قسم کی غیریت یا بیگانگی کبھی تھی ہی نہیں۔ ہم انھیں کوئی آرام نہیں پہنچا سکے۔ ان کی رہائش میں جو انقلاب ان کے ماحول میں جو بنیادی تبدیلی ہوئی تھی اس صدمے کو ہم ہلکا نہیں کر سکے۔ ہماری اس کوتاہی کی شکایت انھوں نے کبھی نہیں کی مگر ان کا منشا کچھ اور ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ تکلیف اٹھائے بغیر کام کا حق ادا نہیں ہو سکتا ہے اور انھیں کام پسند ہوتا تو اس کی خاطر تکلیف اٹھانے میں بھی مزا آتا تھا۔ اس وجہ سے اگر کبھی جامعہ کے عام دستور کے خلاف

انھیں آرام پہنچانے کی کوئی کوشش کی جاتی تو وہ اس پر ناراض ہوتی تھیں، انھوں نے ہماری زندگی کے آداب کو خوشی سے سیکھا اور قبول کیا اور ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ہمیں خلاف معمول یا نامناسب معلوم ہو۔ وہ جامعہ کی، جامعہ کے تمام ہمدردوں اور سرپرستوں کی، بچوں کی اور بڑوں کی "آپا جان" بن گئیں، اس طرح کہ ان کے عورت ہونے کا احساس بالکل مٹ گیا اور اپنے سلیقے اور استعداد سے جو فائدہ وہ جامعہ کو پہنچا سکتی تھیں وہ پورا پورا حاصل ہوا۔

آپا جان کبھی بے فکر اور بے کار نہیں رہ سکتی تھیں۔ کام کے خیال کو اپنے دل سے نکال نہیں سکتی تھیں۔ محنت کرنے والے تھکتے ہیں اور تھکن کو دور کرنے کے لئے سستانا چاہتے ہیں، آپا جان کو سستانا بھی گراں گزرتا۔ اگر کبھی ان کے سپرد کوئی ایسا کام نہ ہوتا جس میں وہ منہمک رہ سکیں تو وہ رنجیدہ اور پریشان ہو جاتیں، سمجھنے لگتیں کہ جامعہ کو ان کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر انھیں اتنے کام دے دئے جائیں کہ جنھیں معمولاً تین چار آدمی کرتے ہیں تو ان کی خوشی، چہرے کی رونق اور رفتار کی تیزی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ بیماری کے زمانے میں ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری طبیعت ہر کام سے تھوڑے دنوں میں ہٹ جاتی ہے، جی چاہتا ہے کہ کوئی اور نیا کام شروع کروں۔ آپا جان کی طبیعت میں استقلال نہیں تھا اور اس میں شک نہیں کہ پکا کام وہی ہوتا ہے جس میں شوق اور سلیقہ اور استقلال تینوں شریک ہوں، لیکن آپا جان کا منصب یہ نہیں تھا کہ ایک دو کام پابندی سے کرتی رہیں۔ جامعہ جس دور سے گذر رہی ہے اس میں یہ مفید نہیں ہے کہ اس کے خادم اپنے مقررہ فرائض انجام دیتے رہیں اور نئی ضرورتوں اور مصلحتوں کا خیال نہ کریں۔ آپا جان ہر وقت نئے کاموں کے لئے بے قرار رہتی تھیں اور ان کی اس بے قراری کے سبب سے جامعہ کے کئی چھوٹے بڑے کام ہو گئے ہیں، جن کے لئے قاعدے سے چلنے والے شاید فرصت ہی نہ نکال سکتے۔ آپا جان کی طبیعت میں صبر اور استقلال کی جو کمی تھی اس پر ان کے شوق کی شدت اور سلیقہ کی جمال آفرینی نے ایک خوش نما پردہ ڈال دیا۔ ہم ان کے کاموں کی خوبی کو دیکھتے رہے،

اس پر خوش ہوتے رہے کہ ان کی توجہ سے ایک ہی کام نہیں بہت سے کام خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپا جان خود بڑی کشمکش میں رہتی ہیں، انھیں ان کا شوق ایک طرف لے جانا چاہتا ہے تو یہ احساس کہ معمول کی پابندی کرنا چاہئے دوسری طرف، ایک کام کو کرتے وقت انھیں دس اور کاموں کی فکر ستاتی رہتی، پھر بھی جتنے نمونے کے کام آپا جان نے کئے، جامعہ میں اور کسی نے نہ کئے ہوں گے۔ ان کا اٹھنا اور بیٹھنا، کھانا اور پینا، ان کے دل کا اجالا، ان کی زندگی کا ماحصل ان کے یہی کام تھے۔ انھوں نے جامعہ کی بستی اور اس کے کاروبار کو اپنے دل میں بسا لیا تھا، جیسے ماں اپنے بچے کو گود میں اٹھا لیتی ہے، اسے وہ بھول سکتی تھیں نہ چھوڑ سکتی تھیں، جو کچھ وہ کرتیں اسی کے لئے کرتیں۔ جامعہ کے کام بہت تھے آپا جان کو جامعہ سے محبت بہت تھی، وہ کاموں کا انتخاب نہیں کر سکیں، ان کو ترتیب نہیں دے سکیں، اس کے لئے جو ذرا سی بے تعلقی ضروری ہے اسے بھی ان کی طبیعت گوارا نہ کر سکی۔

کاروبار بڑے سے بڑا ہو سکتا ہے مگر آدمی کے دل کو اس سے بھی بڑا ہونا چاہئے۔ جامعہ کو سب کچھ دے دینے کے بعد بھی آپا جان کے دل میں بہت جگہ رہ گئی۔ اپنے اور کاموں کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کی سرپرستی اور مدد کرنے کے موقعے تلاش کرتی رہیں۔ لاوارث یہودی مردوں اور عورتوں کے خط آخر تک ان کے پاس آتے رہے، ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان تمام یہودیوں کو جو جرمنی سے بھاگ کر آئے تھے جانتی ہیں اور اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھتی ہیں کہ جس کا ٹھکانا نہ ہو اسے ٹھکانے سے لگائیں۔ جامعہ میں عورتوں اور بچوں کا علاج اور تیمارداری ان کے نزدیک ان کا خاص فرض تھا اور انھیں بڑا دکھ ہوتا اگر ان کی مصروفیتوں کی وجہ سے کوئی بیمار ان کی توجہ سے محروم رہتا اور تمام معاملات میں بھی ان کی انسانی ہمدردی ہر وقت مشورے اور مدد کے لئے حاضر رہتی۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرتی تھیں کہ کوئی ان سے مشورہ لے یا مدد مانگے، خود ہی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے پہنچ جاتیں۔ ہندوستانی عورتیں تیمارداری اور بچوں کی تربیت کے متعلق بہت سی باتیں نہیں جانتی ہیں، آپا جان کو اس کی وجہ سے بڑی فکر رہتی اور

وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح بھی ہو سکے دوسری عورتوں کو جلدی سے وہ سب کچھ سکھا دیں۔ جو خود انھیں آتا ہے۔ انھیں اس کی بھی بڑی آرزو تھی کہ مسلمان عورتوں میں کام کرنے کا سلیقہ اور خدمت کا شوق عام ہو جائے۔ ان کی ہمدردی اور محبت جہاں تک بیداری پھیلا سکتی تھی پھیلاتی رہی۔

عورتوں ہی کے لئے نہیں مردوں کے لئے بھی آپا جان ایک مثال تھیں۔ کام کی دشواریاں ان کے جوش کو کبھی ٹھنڈا نہ کر سکیں۔ جامعہ کی بے مائگی سے ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے، اپنے ساتھیوں کے شوق اور ان کی استعداد پر انھیں ہمیشہ اعتبار رہا، ایسا اعتبار دوسروں میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور بارہا ایسا ہوا کہ آپا جان کی ہمت افزائی نے وہ کام کرا دئے جن کے انجام پا سکنے کی کسی کو امید نہ تھی۔ ان کی سمجھ میں جیسے یہ نہ آتا تھا کہ کام کے ہوتے ہوئے لوگ مطمئن کیسے رہ سکتے ہیں۔ ویسے ہی وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ وہ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ امید تو امید کہلانے کی مستحق تب ہی ہوتی ہے جب وہ قرائن اور استدلال کی پروا نہ کرے، یاس مشربی کی منطق کو اپنے اندر سے اسی طرح گذر جانے دے جیسے کوئی مضبوط درخت گرم ہوا کے جھونکے کو۔ آپا جان کو جامعہ ہمیشہ پھولتی پھلتی، آسمان کی طرف بڑھتی، زمین پر اپنا سایہ پھیلاتی نظر آئی اور انھیں یقین تھا کہ اس کے خلاف کسی کو کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ نظر کا فریب ہے، آپا جان کو سمجھانا اور قائل کرنا آسان نہ تھا۔ آخر میں ہم ہی کو ماننا پڑتا کہ ہمارے اندیشے غلط ہیں، مایوسی بے بنیاد۔ آپا جان کے دل میں امیدوں کی جو روشنی تھی وہ ہماری آنکھوں کا نور بن جاتی۔

بیماری کی بے بسی انسان کا بڑا سخت امتحان لیتی ہے، بیمار کا کوئی فرض نہیں ہوتا حق ہی ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ حق اسے پورا پورا ملے۔ آپا جان کو اصرار تھا کہ انھیں کم سے کم دیا جائے، انھیں برابر اس کی فکر رہتی تھی کہ ان کی وجہ سے جامعہ کے کسی کام کا ہرج نہ ہو۔

آپریشن کے بعد کچھ دن ان کی طبیعت اچھی رہی۔ لوگ ان سے ملنے جاتے تھے تو جامعہ کا ہی ذکر رہتا تھا۔ ان کی حالت بگڑ گئی تب بھی جو دو چار جملے وہ بول سکتی تھیں وہ جامعہ کی نظر ہو جاتے۔ ۱۵ اپریل ۴۲ء کو ان کی سانس اُکھڑ چکی تھی، انھیں دیکھنے کے لئے معمول سے زیادہ لوگ چلے گئے، کئی گھنٹے

بعد انھیں ذرا سا ہوش آیا اور انھوں نے چار پانچ لوگوں کو پلنگ کے گرد کھڑا پایا تو کہا۔" آج جامعہ میں جلسہ نہ ہوگا، آپ سب یہاں آگئے ہیں۔" ہم نے انھیں یقین دلایا کہ "قومی ہفتہ" کا جلسہ ایک دن پہلے ہو چکا ہے تو انھیں اطمینان ہوگیا اور انھوں نے مسکرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ جامعہ کی فکر کے ساتھ انھیں آخر وقت تک آس پاس کے لوگوں کا بھی خیال تھا۔ ہسپتال کے جس مریض کو ضرورت ہوتی اس کے پاس وہ اپنی دوا اور غذا اور نرس کو ضد کر کے بھیجتیں، مریضوں کا حال دریافت کرتی رہتیں، ان کی تکلیف کو اپنا دکھ درد بنا لیتیں۔ انتقال سے ایک، دن پہلے جب ان کی طبیعت ذرا دیر کے لئے سنبھلی تو انھوں نے ایک بچے کو جو قریب کے وارڈ میں رہتا تھا روتے سنا، انھوں نے فوراً نرس کو بھیج کر اپنے پاس بلوایا، بسکٹ کھلائے، پیار کیا اپنے پاس لٹایا اور تھپک کر سلا دیا۔ یہ ان کی آخری محبت کا کرشمہ ان کی نسوانیت کی معراج تھا۔

یہ سب کچھ میں نے دیکھا یا سنا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہ کہنا چاہیئے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں بے ادبی نہ ہوجائے مگر دل نہیں مانتا۔ آپا جان جامعہ کو ایک بہت بڑے احسان سے شرمندہ کر کے گئی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے جو بارہ سال ہمارے ساتھ گذارے ان میں وہ برابر تکلیف اٹھاتی رہیں اور آخر وقت میں بھی وہ جامعہ کی خاطر ایک ایسے حق سے دست بردار ہوگئیں جس کو وہ اپنا حق سمجھتی تھیں۔ انھوں نے دل کی تنہائی قبول کی، عشق کو صبر کا کڑوا گھونٹ پلایا، وعدے کو امید، امید کو حسرت، حسرت کو موت بن جانے دیا اور کہتی رہیں کہ یہی مناسب ہے، ان کی قربانی بارآور ہوئی، ان کی سانس اکھڑی تو جامعہ والوں کو مبارکباد دے کر اکھڑی، بس اور کچھ نہ کہوں گا۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں مجھے قدم رکھنے کی تاب نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ جامعہ والوں میں سے دو ایک بھی اس مقام تک پہنچ جائیں تو ہماری خدمت خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لائق ہو جائے گی۔

پروفیسر محمد مجیب

شفیق الرحمٰن قدوائی

۱۹۰۱ء ——— ۱۹۵۳ء

میں سمجھتا ہوں کہ دوستی سے زیادہ پاک، آدمی کو بنانے والا اور آدمیت کو چمکانے والا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ زندگیاں جنھیں دوستی نے ملا دیا ہو، کسی طرح سے جدا نہیں کی جاسکتی ہیں۔ اسی وجہ سے کوئی اپنے دوست کا ذکر کرتا ہے تو اپنا ذکر کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ آپ معاف فرمائیں اگر مرحوم شفیق صاحب کے ساتھ میں کہیں اپنا ذکر بھی کرتا رہوں۔ اگر آپ لوگوں میں سے، جنھیں شفیق صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تو آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ وہ دوستوں ہی کے نہیں بلکہ ہر شخص کے دوست تھے اور میرا ان کا تو چھبیس ۲۶ سال ساتھ رہا۔ ان کی قبر میں میری زندگی کا بڑا قیمتی حصہ دفن ہو گیا ہے۔ انہیں یاد کروں اور اپنا ذکر نہ کروں .... تو محبت اور دوستی کی بات نہ ہو سکے گی اور مضمون نگاری اس وقت میرا مقصد نہیں ہے۔

شفیق صاحب کی سیاسی تربیت ۱۹۲۰ء کی ستیہ گرہ کی تحریک سے شروع ہوئی میں اس زمانے میں انگلستان میں تھا۔ مجھے حالات کا صحیح علم نہیں۔ شری راج گوپال اچاریہ ۱۹۲۲ء میں ان کے ساتھ ویلور جیل میں تھے، ان دونوں میں بڑی محبت ہو گئی۔ راجہ جی نے اپنے تعزیت کے خط میں وہ عبارت نقل کی ہے جو انہوں نے شفیق صاحب سے ملنے کے بعد اپنی ڈائری میں لکھی تھی کہ "آج علی گڑھ کے ایک نوجوان شفیق الرحمٰن قدوائی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں ایسا شائستہ، شریف، صداقت پرست، خدا سے ڈرنے والا نوجوان نہیں دیکھا ہے۔" راجہ جی اس وقت شفیق صاحب کی ایک اور صفت اُن کی

شفیق صاحب بڑا گاؤں (ضلع بارہ بنکی) میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰ اپریل ۱۹۵۳ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ جامعہ نگر میں دفن کیے گئے۔ (اعظمی)

مستقل مزاجی کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے بارے میں جامعہ والوں سے پوچھئے۔ شفیق صاحب اُن جوشیلے نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے جامعہ کو قائم کیا اور ان گنتی کے چند آدمیوں میں جنھوں نے جامعہ کو قائم رکھا۔ ہوسکتا تھا کہ جامعہ ایک سیاسی چال بن کر رہ جائے۔ ایسا نہیں ہونے پایا۔ جامعہ ایک تعلیمی ادارہ، قومی تعلیم کی نئی تحریک کا ایک نمونہ، قوم پرست مسلمانوں کی آبرو بن گئی۔ ۱۹۲۶ء میں جب میرا نام جامعہ کے خادموں میں لکھا گیا یہ بنیادی بات طے ہوگئی تھی کہ جامعہ قائم رہے گی اور تعلیم کا کام کرے گی۔ شفیق صاحب اس وقت کالج میں پڑھاتے تھے۔ ہاکی کے خاصے مشہور کھلاڑی تھے۔ ہر طرح سے اس بات کو چھپاتے تھے کہ جامعہ والوں کی ہمتیں بڑھانے میں اُن کا کتنا ہاتھ ہے۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ بالکل لاوارث ہوگئی اور ہم لوگوں نے طے کیا کہ لیڈروں کا سہارا نہ ڈھونڈیں گے، اپنا بوجھ خود اُٹھائیں گے۔ میں بغیر سوچے سمجھے ذاکر صاحب کے ساتھ جامعہ چلا آیا تھا اور ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے میں نے ایک عہدنامے پر دستخط کردیئے کہ بیس سال تک جامعہ کی خدمت کروں گا۔ اس کی تدبیریں کرنا کہ جامعہ کا کام کیسے چلے، ذاکر صاحب اور شفیق صاحب جیسے لوگوں کی ذمّے داری تھی۔ بڑی مشکل سے ریاست حیدرآباد سے ایک ہزار روپے مہینے کی امداد منظور کرائی گئی۔ لیکن جب ۱۹۳۰ء کی تحریک شروع ہوئی تو شفیق صاحب اس میں شریک ہوگئے اور دہلی کے چیف کمشنر نے گرانٹ کو بند کرادیا۔ اس سے جو مایوسی ہوئی، اس کے مقابلے میں وہ کارنامے تھے جو شفیق صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے دہلی میں کر دکھائے اور شفیق صاحب جیل سے نکل آئے تو گرانٹ کو دوبارہ جاری کرانے کا بندوبست بھی ہوگیا۔

۱۹۳۰ء میں مَیں اورنگ آباد میں ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھا۔ جامعہ کی خبریں بس کبھی کبھی سننے میں آتی تھیں۔ شفیق صاحب ایک ساتھی تھے جن کی کارگزاریوں کی داستان سُن کر خوشی ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد انھوں نے چندہ جمع کرنے کا پروگرام بنایا اور مجھے اس میں شامل کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس کام کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوں مگر شفیق صاحب کوئی بات طے کرلیتے تھے چاہے وہ اپنے لئے ہو یا دوسروں کے لئے، تو اُسے ماننا ہی

پڑتا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا کہ مجھے محبت، خلوص اور میٹھی باتوں کی ایک نرم گدگدی چادر میں لپیٹ لیتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے اُسے مان لیا کرتا تھا چاہے میری رائے کچھ اور ہوتی۔ انھوں نے طے کیا تھا کہ مجھے ساتھ لے کر دہلی سے بمبئی جائیں گے۔ بمبئی میں سفر خرچ جمع کر کے کولمبو پہنچیں گے اور وہاں چندہ مانگیں گے۔ وہ میری طبیعت سے واقف نہیں تھے۔ بعد کو انھیں سے معلوم ہوا کہ انھوں نے سوچا تھا کہ بھگتنا پڑا تو بھگت لیں گے۔ سفر میں جتنا کوئی دوسرے کے لئے کر سکتا ہے وہ انھوں نے میرے لئے کیا۔ جب ہم کسی کے پاس چندہ مانگنے جاتے تو وہ مجھے آگے رکھتے تھے اور باتیں خود کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدمی کو اور موقع کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ کوشش زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ اُمید بہت کم کی رکھتے ہیں۔ گفتگو جذباتی ہوتی ہے، فیصلے ٹھنڈے دل سے کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چندہ مانگنے کے کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

جب کوششوں کے نتیجے پر غور کرنے کا وقت آیا تو میری یہ رائے تھی کہ چندہ مانگنے میں محنت اور وقت بہت صرف ہوگا اور حاصل بہت کم ہوگا اور میں بہرحال ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جس کے ساتھ لگنے سے کسی کو کوئی مدد مل سکے۔ شفیق صاحب نے طے کیا کہ چندہ بہت بڑے پیمانے پر، منتظم طریقے سے جمع کرنا چاہیئے۔ مگر ہر دینے والے سے اتنا ہی مانگنا چاہیئے جتنا کہ وہ آسانی سے دے سکے۔ اس پلان کے مطابق انھوں نے جامعہ کے ہمدردوں کا ایک حلقہ بنایا۔ کسی نے دو آنے یا چار آنے دینے کا وعدہ کیا تو اُسے بھی قبول کیا۔ اور چندہ وصول کرنے لگے۔ اس کام میں وہ پانچ چھ برس تک لگے رہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو کس طرح دل و جان سے اس کام کے لئے وقف کر دیا ہے۔ انھوں نے اعداد و شمار جمع کئے، چارٹ بنائے، گراف بنائے۔ کسی کو سمجھاتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک تحریک کے رہنما ہیں اور ہر بات کی ہر وقت خبر رکھتے ہیں۔ آخر میں جب جامعہ کے ہمدرد دس ہزار سے زیادہ ہو گئے اور خالص ڈیڑھ ہزار ماہوار ہو گئی تو انھوں نے اس بنے بنائے کام کو دوسروں کے سپرد کر دیا۔ کام کو ترقی دے کر چھوڑ سکنا، اس کے لئے جو محنت کی ہو اُسے بھول جانا اس سے جو عزت اور حیثیت حاصل ہوئی ہو اُسے خوشی کے ساتھ دوسرے کی نذر کر دینا اسی کے لئے ممکن ہوتا ہے

جس کا دل بہت بڑا ہو۔شفیق صاحب چاہتے تو جامعہ کے اُن داتا بنے رہتے۔ان کو شوق خدمت کا تھا اُس کی پروا نہیں تھی کہ اُن کی محنت کی کمائی کو کون وصول کرتا ہے۔ انھوں نے چندہ جمع کرنا چھوڑ دیا۔ایک نئے کام میں لگ گئے جس کو بالکل شروع سے شروع کرنا تھا۔

یہ نیا کام بالغوں کی تعلیم کا تھا۔اس کا انھیں ذرا بھی تجربہ نہیں تھا اور جامعہ سے انھیں نہ کوئی سرمایہ ملا نہ کوئی سامان۔خود انھوں نے اس کا ارادہ کیا تھا کہ اپنا کام خود چلائیں گے اور جامعہ پر کسی طرح کا بار نہ ڈالیں گے۔انھوں نے مختلف طریقے آزمائے۔مسجد، محفل، گھر، بازار سب کو تجربے کا میدان بنایا اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنے لئے ایک راہ نکال لی۔اُن کی گفتگو میں ہمیشہ زور اور جوش ہوتا تھا لیکن وہ اپنے کام کو بڑی سختی سے جانچتے بھی تھے۔میں اُن کی باتیں سنتا تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالغوں کی تعلیم کے لئے صحیح طریقے کی نہیں حق کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔اور شاید یہی بات تھی جس سے اس میدان کے تمام کام کرنے والوں میں ان کی ایک خاص حیثیت ہوگئی۔ انھوں نے جامعہ کے صرف ایک شعبے کو ترقی نہیں دی بلکہ سماجی تعلیم کا شوق رکھنے والوں کو مجاہدوں کی ایک جماعت بنا لیا۔

شفیق صاحب کی وضع داری ایسی تھی کہ کام کو بدلنے سے ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہیں پیدا ہوا۔جو لوگ سیاسی تحریکوں میں اُن کے ساتھ تھے وہ چندہ جمع کرنے میں اُن کی مدد کرتے رہے۔جنھوں نے چندہ جمع کرنے میں ان کی مدد کی تھی، انھیں بالغوں کی تعلیم سے دل چسپی ہوگئی۔ان کی صداقت، ان کے خلوص، ان کی دوست مزاجی کا اتنے لوگوں پر اثر تھا کہ جب آزادی کے بعد نیا انتخاب ہوا تو دوستوں نے اصرار کیا کہ شفیق صاحب سیاست کے میدان میں آجائیں۔وہ خود اندیشیا میں تھے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔یہاں دہلی میں ان کی طرف سے ساری کارروائیاں ہوگئیں اور وہ اپنے حلقے میں منہ دکھائے بغیر منتخب ہوگئے۔

آپ نے اکثر یہ شکایت سنی ہوگی کہ آزادی ملنے کے بعد ہماری حکومت کا طریقہ بہت کم بدلا ہے۔یہ شکایت سب اپنے اپنے مطلب سے کرتے ہیں۔ مجھے جو بات نظر آتی ہے، وہ یہ ہے

کہ جن لوگوں نے حکومت کو سنبھالا وہ سیاسی کاموں کو انجام دینے میں اور اپنے عہدوں کا حق ادا کرنے میں اس طرح مصروف ہو گئے کہ ان کا معمول اُن کے اور جنتا کے درمیان ایک اوٹ سا بن گیا۔ دراصل یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ لیکن شفیق صاحب کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ اُن کا وزیر ہونا کسی کو محسوس ہو۔ اُن کے اخلاق میں کچھ اور وسعت، اُن کے انکسار میں کچھ اور شدت پیدا ہو گئی۔ حکومت کا کام اُن کے لئے دلجوئی کا ایک عظیم الشان منصوبہ بن گیا۔ وہی شائستگی، شرافت اور خدا ترسی جو راجہ جی کو ۲۲ء میں جیل کے نوجوان ساتھی میں نظر آئی تھی، ایک نئے مقام پر پہنچ کر اور زیادہ چمکنے لگی۔ چمکنے لگی اور دیکھتے دیکھتے بجھ گئی۔ اب تاریکی اور سناٹے میں شفیق صاحب کی ہمت، اُن کا دوست کو سمجھانا، مخالف کو راضی رکھنا، ارادے کی مضبوطی کو ہنس ہنس کر چھپانا، صرف خدا کے حق کو مانتے ہوئے ہر ایک آدمی کا حق ادا کرنا، یہ سب بہت یاد آتا ہے۔ دنیا کا کام تو بہرحال چلتا رہے گا لیکن دوست کو تسلّی دوست سے ہی ہو سکتی ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

مولانا محمد اسلم جیراجپوری

۱۸۸۲ء ——— ۱۹۵۷ء

مولانا محمد اسلم جیراجپوری کے نام سے پہلے پہل میں اس وقت آشنا ہوا جب میں نے ان کی "تاریخ الامت" دیکھی۔ طالب علمی کے ابتدائی دور میں جب میں تاریخِ اسلام کا مطالعہ کر رہا تھا، میرے ایک کرم فرمانے "تاریخ الامت" کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے پوچھا "کیا تم نے وہ کتاب دیکھی؟" میں نے کہا "جی ہاں" کہنے لگے "مصنّف کو بھی دیکھا ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا "کیا وہ زندہ ہیں؟" اس تعجب میں اپنی لاعلمی بھی شامل تھی اور وہ تاثر بھی پوشیدہ تھا جو "تاریخ الامت" کے پڑھنے کے بعد دل و دماغ پر طاری تھا۔

اب اِسے حُسنِ اتفاق کہوں یا امتدادِ زمانہ کا احسان کہ اس وقت میں جامعہ کالج میں اُن کے ایک ادنیٰ ساتھی کی حیثیت سے درس دیتا ہوں۔ پہلے دن جب میں کالج پہنچا تو ایک "مردِ بزرگ" کی طرف اشارہ کر کے ایک صاحب نے فرمایا "یہ مولانا اسلم جیراجپوری ہیں" میں نے بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ خوش ہوئے اور فرمایا "اچھا ہوا آپ یہاں آگئے" بس، اس دن سے لے کر آج تک، کہ ایک سال سے زیادہ کی مدت گزری میں اُن کو بہت قریب سے، چلتے ہوئے، بیٹھتے ہوئے، نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے، پڑھتے ہوئے، پڑھاتے ہوئے، حقّہ پیتے ہوئے، دوسروں کو حقّہ پیش کرتے ہوئے —— غرض مختلف انداز میں بڑے غور سے دیکھتا رہا ہوں۔

یہ مضمون ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے تقریباً دو سال بعد مولانا کا ۱۹۵۷ء میں انتقال ہو گیا۔

مولانا محمد اسلم جیراجپوری ۱۸۸۲ء میں اپنے وطن موضع جیراجپور (ضلع اعظم گڑھ) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد مولانا سلامت اللہ مرحوم حج کو گئے ہوئے تھے۔ جب وہ خانہ کعبہ کی زیارت سے واپس آئے تو اُن کو نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بُلا کر مدرسۂ وقفیہ (بھوپال) کا صدر مدرس بنا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ مدرسۂ سلیمانیہ کے نائب مہتمم اور پھر اس کے بعد ریاست بھوپال کے صیغۂ تعلیمات کے مہتمم ہو گئے۔ نواب صاحب علم وفضل کے قدردان تھے عربی وفارسی پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کی عربی کی تصانیف کی شہرت ممالکِ اسلامیہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں کھنچ کر پہنچتے تھے۔ عراق، شام اور نجد وغیرہ کے علماء اور طلباء بھی کبھی کبھی وہاں آتے رہتے تھے۔ مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم چونکہ سلیقۂ گفتگو میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھے اور عربی نہایت صاف اور بے تکلف بولتے تھے، اس لئے عرب مہمانوں سے گفتگو کے لئے بیشتر وہی بُلائے جاتے تھے۔

اُس زمانے میں بھوپال علماء وفضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عربی زبان و ادب، حدیث وقرآن اور منقولات ومعقولات کا ایک سے ایک جیّد عالم وہاں موجود تھا۔ قاضی عبدالحق صاحب سرحدی، شیخ حسین عرب اور مولوی بشیر احمد صاحب سہسوانی جیسے علماء جہاں جمع ہوں اُس شہر کا "عیارستانِ بازارِ علم" میں کیا درجہ ہوگا، اسے جاننے والے خوب جانتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے وقت کا امام تھا۔ اِس قسم کے لوگ اب اس زمانے کی مٹی سے نہیں ڈھالے جاسکتے۔ ان کا ذکر میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ بھوپال کے اس علمی ماحول میں مولانا اسلم کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ مولانا کا کہنا ہے کہ انھوں نے اِن سب فضلائے روزگار کو دیکھا ہے۔

مولانا اسلم چھ سال کے تھے کہ ان کے والد انھیں بھوپال لے گئے اور ابھی ان کی عمر کا نواں سال ہی تھا کہ انھوں نے قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اب اس کے بعد فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"حفظِ قرآن کی بدولت محنت کی عادت پڑ گئی تھی اور حافظہ قوی ہو گیا تھا، جو کچھ پڑھتا تھا

چند بار دُہرانے سے از بر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گلستان اور بوستان دونوں کتابیں پوری پوری یاد کر ڈالیں ..... قواعد کی مشق لکھا کر کرائی گئی۔ چنانچہ اس نوشتہ کو "قواعد اصلیہ" کے نام سے میں نے اسی زمانے میں سرکاری مطبع میں طبع کرا دیا تھا۔ ایک جزو کا مختصر رسالہ سلیس فارسی زبان میں ہے۔"

فارسی کا کل مرحلہ چار سال میں ختم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ریاضی بھی۔ پھر ایک ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھی۔ اس کے بعد عربی کا سلسلہ شروع ہوا۔ صرف، نحو، فقہ، اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، ادب، حدیث و قرآن کی پوری تعلیم مولانا نے مولوی فتح اللہ صاحب اور اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ دراصل یہی دو اُستاد تھے جن کے قدموں میں بیٹھ کر مولانا نے علومِ دینیہ کی تکمیل کی۔ مولوی فتح اللہ صاحب ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور صرف و نحو اور فقہ و اصولِ فقہ کے اچھے اُستاد مانے جاتے تھے۔ ہمارے یہاں یہ بات اصول کی حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کسی عالم نے کسی عربی مدرسے سے دستارِ فضیلت نہیں حاصل کی ہے تو اُسے عالم نہیں مانتے اور اس کے علم کو ناقص جانتے ہیں۔ بہتوں پر آج تک یہ اعتراض کیا جاتا ہے اور مولویوں کا ایک بڑا طبقہ مذہب کے معاملے میں ان کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی اسی قسم کی باتیں کہی جاتی تھیں ---- اور مولانا اسلم تو ساری عمر اسی چیرہ دستی کا شکار رہے ہیں۔ اب ان معترضین کو کون سمجھائے کہ مدرسہ و خانقاہ کے باہر بھی علم ہے اور اپنی تمام پہنائیوں کے ساتھ دعوتِ اصلاح و اجتہاد دیتا رہتا ہے۔

اکیس۲۱ سال کی عمر میں مولانا محمد اسلم جیراجپوری اپنی تعلیم و تربیت کے دَور سے گزر چکے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور پیسہ اخبار (لاہور) میں مترجم کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ لیکن دوسرے سال ہی والد کی بیماری نے انھیں بھوپال بُلا لیا۔ چند روز کے بعد ان کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ پھر مولانا لاہور نہیں گئے۔ ۱۹۰۶ء میں وہ علی گڑھ پہنچے۔ اور وہاں کالجیئٹ اسکول میں عربی اور فارسی کا درس دینے لگے۔ چھ۶ سال کے بعد کالج کی لٹن

لائبریری میں مشرقی کتابوں کا شعبہ ان کے سپرد ہوا - وہاں انھوں نے کتابوں کی فہرست مرتب کی جو اپنی جگہ خود ایک بڑی علمی خدمت ہے - پھر وہ کالج میں آگئے اور عربی اور فارسی کے پروفیسر ہوگئے - ۱۹۲۰ء تک کالج سے وابستہ رہے - یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری قومی زندگی کا دھارا بہت تیز بہنے لگا تھا اور ایک عمومی حرکت نے ملک و قوم کے سامنے شاندار مستقبل کی راہیں کھول دی تھیں - تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام سے کون ناواقف ہے - درحقیقت ہماری قومی زندگی "لذتِ کام و دہن" کی آزمائش سے گزر چکی تھی - اس کی رگ و پے میں اب ایک دوسرے غم کا زہر اُتر چکا تھا - اب ہم اس منزل پر تھے جہاں دار و رسن کی آزمائش تھی - مولانا اسلم نے اس منزل پر وطن اور ملت کا ساتھ نہیں چھوڑا - جب وقت آیا تو انھوں نے علی گڑھ کالج کو خیرباد کہہ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے - یہ گویا مادی سکون و اطمینان کو تیاگ کر بے سروسامانی کو اوڑھنا بچھونا بنانا تھا - مولانا نے اسبابِ عیش سے محروم ہوجانا اور قوم کی آبرو کا محافظ بننا پسند کیا - اس وقت سے لے کر آج تک جامعہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے شاہانہ وقار کے ساتھ تعلیم و تعلّم کا کام کر رہے ہیں کہ بوریائے علم کے سامنے تخت و تاج بھی سر جھکاتے ہیں -

مولانا عالمِ دین ہیں - حافظِ قرآن ہیں - کتابِ الٰہی کے اسرار و رموز پر نظر رکھتے ہیں، مؤرخ ہیں - شاعر ہیں اور اعلیٰ درجے کے ادیب و انشا پرداز ہیں - مولانا اسلم تاریخِ اسلام کے اچھے عالم ہیں - اس سلسلے میں ان کی دو مشہور کتابیں علمی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں - تاریخ الامارت (آٹھ جلدوں میں) اور تاریخِ نجد - فاتح مصر عمر ابن العاص کی سیرت اور حافظ و جامی کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری پر تبصرہ کر کے مولانا نے سیرت نگاری اور سوانح نگاری کے میدان کو بھی نہیں چھوڑا - ان کتابوں کے ماخذ عربی و فارسی کی مستند کتابیں ہیں - بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے قدیم کتبِ تاریخ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے - میرے نزدیک یہ کوئی جُرم نہیں ہے - تاریخ مستند ماخذوں کے سہارے ہی پڑھی اور مرتب کی جاتی ہے -

میں مولانا کو مورخ اس لئے مانتا ہوں کہ تاریخِ اسلام کو انھوں کو کھنگالا ہے، واقعات کے اسباب وعلل اور ان کے نتائج کو تنقیدی نظر سے جانچا ہے۔ زمانے کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی آئینے میں سلطنتوں کے عروج و زوال کی تصویریں دیکھی ہیں۔

آپ ان سے گفتگو کیجئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی نگاہ کتنی دُور تک پہنچتی ہے، البتہ تاریخ الامت میں ایک چیز کی کمی مجھے نظر آئی اور وہ یہ کہ معاشی حالات کا جو اثر معاشرتی نظام پر پڑتا ہے اور یہ اثر کافی گہرا پڑتا ہے، اسے مولانا نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے مولانا سے گفتگو کی۔ وہ تہذیب و تمدن کی تاریخ میں معاشی عناصر کو اہمیت دیتے ہیں۔ پھر نہ معلوم کیوں تاریخ اسلام کو انھوں نے اس نقطۂ نظر سے نہیں پرکھا۔

مولانا اسلم نے شاعری بھی کی ہے اور فارسی اور اُردو میں اچھے شعر کہے ہیں مگر یہ مشغلہ زیادہ دنوں تک نہیں چلا۔ اسے موانع کار میں سے سمجھ کر انھوں نے ترک کر دیا۔ مولانا کے اشہبِ قلم کی جولانی اور بحرِ تخیل کی پہنائی دیکھنا ہو تو ان کے ادبی و تنقیدی مضامین پڑھیے۔ ان کی تحریروں میں آپ طنز و مزاح بھی پائیں گے اور توازن اور تعمیری پہلو بھی۔ وہ آجکل کے بعض خود ساختہ نقادوں کی طرح تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی مثنوی اسرار خودی جب پہلی بار شائع ہوئی تو تصوّف کی بحث میں حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کے متعلق علامہ کے خیالات پر بعض لوگوں نے احتجاج کیا۔ جب بڑی گہماگہمی ہوئی اور مخالفین و موافقین کی طرف سے بے معنی تحریروں کا ایک طومار بندھ گیا تو مولانا نے قلم اُٹھایا اور اپنے خاص انداز میں ایک متوازن رائے پیش کر دی۔ اس سلسلے میں "تصوّف اور اسلام" پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کا شمار انشا پردازی کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> "...... جب تاتاریوں کے حملے شروع ہوئے اور چنگیز اور ہلاکو نے ایک قیامتِ صغریٰ برپا کر دی تو اُن کی ہولناک خونریزیوں سے اُمّت کے فاتحانہ جذبات پٹ گئے، دنیا کی طرف سے ان کے

دل سرد ہوگئے۔ طبیعتوں کا جوش اور ولولہ جاتا رہا۔ حوصلے پست اور ہمتیں سُست ہوگئیں۔ زوال وفنا کے نقشے آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ میلانِ خاطر زہد و ترکِ دنیا کی طرف بڑھ گیا اور سرمایۂ توکّل و قناعت کو لے کر گوشۂ عافیت میں بیٹھنا پسند آیا۔ عالمِ فانی کے جاہ و جلال کی وقعت نگاہوں میں نہ رہی۔ بوریائے فقر سریرِ سلطنت سے زیادہ عزیز ہوگیا..... ذوقِ عمل طبائع سے یہاں تک مسلوب ہوگیا کہ "شیوۂ قلندری" کے مقابلے میں "رہ و رسم پارسائی دور و دراز نظر آنے لگی۔ عالمِ ذوق میں حلقۂ یاراں میں "خلوت در انجمن" ہونے لگی اور سجادہ ہی پر "سفر در وطن" کی کڑی منزلیں طے کی جانے لگیں ..... یہ اثرات اگر صرف ایک ہی جماعت تک محدود ہوتے تو نقصان نہ ہوتا، لیکن شاعری کے ساز پر یہ ترانہ کچھ اس انداز سے چھیڑا گیا کہ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا اور ادبیاتِ اسلامیہ میں ایک قسم کے جمود اور رہبانیت کا اثر طاری ہوگیا۔"

مولانا کی انشا پردازی سے متعلق ان کے مضامین سے اس قسم کے بہت سے پُر زور اور زنگا رنگ ٹکڑے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ کسی صاحب کو اگر مطالعے کا شوق ہو تو وہ "نوادراتِ" پڑھیں۔ مولانا کے مضامین کا یہ گراں بہا مجموعہ ادارۂ طلوعِ اسلام (کراچی) نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔

مذہب، سیاست، معیشت و معاشرت غرض زندگی کے کسی شعبہ میں مولانا کی طبیعت کورانہ تقلید اور جمود و تعطّلِ فکر و نظر کو برداشت نہیں کرسکی۔ مذہب کے معاملے میں مولانا آرتھوڈاکس مکتبِ خیال سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ قرآن کو اسلام سمجھتے ہیں اور حدیث کو حجت نہیں گردانتے۔ مُلّائیت اور کلیسائی نظام کے سخت مخالف، جمہوریت کے شیدائی اور استبداد کے دشمن ہیں اور کہتے ہیں کہ "شوکتِ اسلام کے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ جمہوریت جو اسلام لے کر آیا تھا اور جس نے ہر مسلمان کو آزاد اور خود مختار بنا دیا تھا، مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی۔"

مولانا کی شخصیت کی انفرادیت مسلّم ہے۔ اس کے ثبوت میں یہی ایک بات کافی ہے کہ

مولانا نے جس ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تعلیم و تربیت نے جس منصب کے لئے انھیں تیار کیا تھا، اگر وہ چاہتے تو اس سے فائدہ اٹھاتے اور دنیا کماتے۔ ہزاروں ایسے مل جاتے جو ہاتھ چومتے اور ایک نگاہِ کرم کے منتظر رہتے۔ نفسِ انسانی بڑا مفسد ہے۔ اچھے اچھوں کے قدم میں لغزش پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن مولانا نے اپنا کام سمجھ لیا تھا۔ اور اپنی راہ متعین کر لی تھی۔ علم و تدبّر کو انھوں نے اپنا پیشوا بنایا اور قبائے مشیخت اور جُبّۂ پیشوائیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس راہ میں انھیں دشوار گزار مراحل سے گزرنا بھی پڑا لیکن وہ ان سب سے آسان گزر گئے اور اس کی پرواہ نہیں کی کہ مذہبی دنیا انھیں کیا کہتی ہے ؎

اُس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال کے محرم نہیں پیرانِ طریق

عبداللطیف اعظمی

حامد علی خاں

۱۹۰۵ء —— ۱۹۶۳ء

حامد علی خاں صاحب جامعہ کے ابتدائی دَور کے گریجویٹ اور اس کے حیاتی رکن تھے تعلیم کے بعد شروع سے جامعہ سے وابستہ رہے اور اپنی غیر معمولی صلاحیت، اَن تھک محنت اور بے لوث خدمت کے ذریعہ اُردو کی تصنیفی اور اشاعتی دنیا میں انقلاب پیدا کیا مکتبہ جامعہ غالباً اُردو کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جس نے محض اپنی کتابوں کی آمدنی پر اتنی ترقی کی کہ اُردو کے ممتاز ترین اداروں میں سمجھا جانے لگا اور پہلا ادارہ ہے جس نے ہر لحاظ سے — خواہ کتابوں کی ظاہری شکل وصورت ہو یا زبان، اسلوب بیان اور معیار کا معاملہ ہو —— اُردو ادب کو جدید طرز اور نئے انداز سے آشنا کیا اور بچوں کے ادب کو، جس کی طرف نئے تقاضوں کے مطابق بالکل توجہ نہیں کی گئی تھی، قابلِ لحاظ ترقی دی مکتبہ جامعہ کے یہ کارنامے تمام تر مرہونِ منت ہیں جناب حامد علی خاں صاحب کی مساعی اور صلاحیتوں کے۔

حامد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور مئی ۱۹۲۷ء میں جامعہ میں کام شروع کیا اور ۱۹۲۸ء میں تاحیات یا کم سے کم بیس سال تک جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔ مکتبہ جامعہ کی ترقی کا سہرا حامد صاحب کے سر ہے۔ آزادیٔ وطن سے قبل جامعہ کے تمام شعبوں میں انتہائی تنگی ترشی سے زندگی گزرتی تھی۔ مکتبہ کی زندگی بھی ناساعد حالات اور کٹھن مشکلات سے بھری ہوئی تھی، مگر حامد صاحب کبھی دل شکستہ نہیں ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے سہارے اردو زبان وادب کی خدمت میں برابر لگے رہے۔

حامد صاحب کی رہنمائی اور نگرانی میں مکتبہ نے اُردو کے معیاری ادب میں بھی اور عام پسند

حامد صاحب قائم گنج میں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو پیرس میں انتقال کیا۔ جامعہ نگر میں دفن کئے گئے

کتابوں میں بھی بیش از بیش اضافے کئے اور جب ملک کی کشتی ساحلِ آزادی سے قریب پہنچی اور ۱۹۳۸ء میں مختلف صوبوں میں قوم پرستوں کی حکومت قائم ہوئی، تو بعض صوبوں نے اسکولوں کے لئے ملکی ضروریات اور قومی مفاد کے پیشِ نظر نئی ریڈریں تیار کروانے اور اُن کو شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اہم اور ضروری کام کو انجام دینے کے لئے مکتبہ نے اپنی خدمات پیش کیں اور حامد صاحب کے تدبر اور ان کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے مکتبہ کو کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے فساد میں مکتبہ جامعہ کی چوتھائی صدی کا سرمایہ جب جل کر تباہ و برباد ہو گیا تو حامد صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے مشورے اور مدد سے از سرِ نو مکتبہ کو قائم کیا تو بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر اس مرتبہ لمیٹڈ کمپنی کی شکل دی گئی۔ حامد صاحب کے لئے یہ تجربہ بالکل نیا تھا مگر اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اس مرحلے سے بھی کامیابی کے ساتھ گزر گئے۔

۱۹۵۷ء میں حامد صاحب کو زیادہ وسیع میدانِ عمل ملا۔ اب تک اُنھوں نے صرف اُردو زبان و ادب کی خدمت کی تھی اور ان کی جولانگاہ صرف اپنے ملک تک محدود تھی، مگر یونسکو نے اُن کو دوسری زبانوں اور دوسرے ملکوں کی خدمت کا بھی موقع دیا۔ پہلی مرتبہ صرف تین سال کے لئے تقرر عمل میں آیا تھا، مگر ان کے وسیع تجربے، ان کی غیر معمولی صلاحیت اور اُن کے حُسنِ خدمات اور احساسِ ذمّہ داری کی وجہ سے یہ تقرر مستقل کر دیا گیا۔ موصوف نے سات سال کی اس مختصر مدت میں اپنے ملک اور اپنی مادرِ علمی کے نام کو بڑا روشن کیا، مگر افسوس کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا، جس کی وجہ سے اُردو ایک صاحب ذوق اور حوصلہ مند ناشر سے، جامعہ ایک قدیم حیاتی رکن سے اور یونسکو ایک مخلص اور آزمودہ کار ہندوستانی ماہرِ نشر و اشاعت سے محروم ہو گئی۔ حامد صاحب اب ہم میں نہیں رہے، مگر جامعہ کے در و دیوار پر اور اُردو کتابوں کی نشر و اشاعت کے جدید طرز اور گیٹ اپ پر اپنا گہرا اور پائدار نقش چھوڑ گئے ہیں، اُن کی جب بھی کوئی تاریخ لکھی جائے گی، حامد صاحب کا ذکر ضرور آئے گا۔

پروفیسر محمد مجیب

اختر حسن فاروقی

۱۹۰۱ء ——— ۱۹۶۵ء

ہر ادارے کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کارکن اور خیر خواہ اپنا اور اپنے کام کا جائزہ لیتے رہیں اور ٹھنڈے دل سے غور کرتے رہیں کہ ان میں کونسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ادارے کو ترقی کرنے میں مدد ملی ہے اور ان خصوصیات کو کس طرح اور زیادہ مستحکم اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔ جامعہ میں اس طرح کا جائزہ لینے کا کوئی مقرر طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے، لیکن ہم اپنے ممتاز کارکنوں کی یاد میں اپنی خصوصیات کا ذکر کرتے رہے ہیں اور اس تنقید سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو اعتراض کرکے ختم ہو جاتی ہے اور آگے چلنے کا رستہ نہیں دکھلاتی۔ جناب اختر حسن فاروقی کے تعزیتی جلسے میں جو تقریریں ہوئیں انھوں نے جامعہ کے کارکنوں کی خصوصیات کا جائزہ لینے کی خواہش پیدا کی اور میں چاہتا ہوں کہ ایک دوست اور ساتھی کی یاد تازہ کرنے کے ساتھ انھوں نے جامعہ کی جس طریقے سے خدمت کی اسے نمایاں کردوں۔

اس وقت جو لوگ جامعہ میں ہیں وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ۱۹۲۶ء میں جب اختر صاحب مرحوم جامعہ میں آئے تھے، تو یہاں کیا کیفیت تھی اور جامعہ کو لوگ کن نظروں سے دیکھتے تھے۔ ہماری سوسائٹی میں کچھ لوگ تھے جو جامعہ کے مقاصد کو کسی حد تک سمجھتے تھے، جو جامعہ والوں سے ہمدردی کرتے تھے ان کے جوش کی داد دیتے تھے اور ان کے کام کی تعریف کرتے تھے، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو جامعہ کو قائم کرنے اور چلانے کی کوشش کو بے حاصل اور بے کار سمجھتی تھی کیونکہ جامعہ کے کوئی اپنے وسائل نہیں تھے، حکومت وقت اس کے خلاف تھی اور اس کے کام کے بڑھنے کا کوئی

اختر حسن فاروقی مرحوم کا اصل وطن فرخ آباد (یوپی) تھا، وہیں ۱۵ مئی ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے، مگر نشو و نما اور تعلیم لکھنؤ میں ہوئی اور بعد کو اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ (اعظمی)

امکان نظر نہیں آتا تھا۔ جامعہ کے مستقبل کے لیے زیادہ اہم ان لوگوں کی نیت اور ان کا حوصلہ تھا جنھوں نے جامعہ میں رہ کر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا، ان میں سے بعض ایسے تھے جو جامعہ کے مقاصد کو اصولی بحث کر کے طے کرنا چاہتے تھے اور جو جامعہ کے وجود کو اسلام کی تعلیمات اور ہندستانی مسلمانوں کے فرائض کے ایک اصولی اور منطقی نقشے کا ایک حصہ بنانا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے طرز بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ اصولی طور پر جامعہ کے مقاصد صحیح نہ رہے تو جامعہ کا وجود بے کار ہو جائے گا۔ قوم کی خدمت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اور خود قوم بھی گمراہ ہو جائے گی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اصولی بحث کرنے والے کسی خاص نتیجے پر پہنچے، لیکن ان کی بحث سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بہت سے لوگ خاموش ہو گئے اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جامعہ کو قائم رکھنے کے لئے صبر سے کام کرتے رہنے اور بہتر حالات کا انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ شفیق الرحمان قدوائی مرحوم میں یہ غیر معمولی صفت تھی کہ وہ بحث کرنے والوں سے بحث کر سکتے تھے اور خاموش کام کرنے والوں کی طرح کام بھی کر سکتے تھے، اختر صاحب مرحوم بحث کرنے کا شوق نہیں رکھتے تھے، لیکن اصولی بحث کا ان کے اوپر اثر ہوتا تھا اور جب کبھی ان کے دل میں مایوسی پیدا ہوتی تو وہ کام کرنے والوں کی طرف جن میں وہ خود بھی بہت پیش پیش تھے دیکھتے اور ان کی آنکھیں یہ سوال کرتیں کہ بتایئے اب کیا ہوگا۔ کبھی کبھی ان پر ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے، انھوں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ جامعہ کے مقاصد ان کی سمجھ میں آگئے ہیں اور کبھی وہ اس طرح ہمت کر کے آگے نہیں بڑھے کہ دوسرے ان کے پیچھے چل سکیں۔ وہ دراصل ان لوگوں میں سے تھے کہ جن کی محبت کسی دلیل کی دست نگر نہیں ہوتی، جن کے شوق کو ابھارنے کے لئے کسی خارجی اثر کی ضرورت نہیں ہوتی، جو گویا غیر مشروط خدمت کا نمونہ بن جاتے ہیں، اس لیے کہ ان کی طبیعت یہی چاہتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔

اختر صاحب مرحوم اچھے استاد تھے، مگر ان کی فنی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ نمایاں ان کی محبت تھی، اسی محبت کو انھوں نے تربیت کا ذریعہ بنایا اور اسی کے سایے میں بہت سے نوجوانوں کی صلاحیتوں نے پرورش پائی، لیکن ان کی کارگزاری یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، جامعہ کی برادری میں انھیں

امتیاز حاصل کرنے کی خواہش نہیں تھی اور اس کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی، لیکن جامعہ سے انھیں جو محبت تھی وہ دوسرے کے شوق اور جوش کو بڑھانے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ انھوں نے مجھ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ جامعہ کی خدمت اس طرح سے یا اس طرح سے کرنا چاہیے، کبھی یہ نہیں پوچھا کہ فلاں کام جو ہونا چاہیے کیوں نہیں ہوا، لیکن ان کی ہر بات سے اور ہر کیفیت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ جامعہ کی ترقی اور جامعہ کے ہر چھوٹے بڑے کارکن کی بھلائی چاہتے ہیں اور جو شدت ان کی اس خواہش میں ہے وہ ہر ایک میں ہونا چاہیے۔ یہ استعارہ کئی لحاظ سے موزوں نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے جو بات اس کے ذریعہ کہی جاسکتی ہے وہ کسی اور طریقے سے نہیں کہی جاسکتی ——— اختر صاحب مرحوم کو جامعہ سے ویسی ہی محبت تھی جیسے ماں کو اپنے بچے سے ہوتی ہے، ماں کی جبلی محبت اختر صاحب مرحوم میں توفیق کا مرتبہ رکھتی تھی اور یہ توفیق جس طرح انھیں عطا ہوئی تھی جامعہ میں شاید کسی اور کو عطا نہیں ہوئی۔

جامعہ میں نئے لوگ آتے رہتے ہیں اور پرانے ساتھی ایک ایک کر کے جدا ہو رہے ہیں۔ اختر صاحب مرحوم کی صحبت میں رہنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میں دیکھتا رہتا ہوں کہ جو لوگ جامعہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ اب ہم میں شاید ایک دو ایسے ہوں گے جو اصولی بحث کرتے ہیں اور اسلام اور قومی خدمت کے ایک خود ساختہ معیار کے مطابق ہر خیال اور ہر فیصلے کو جانچتے ہیں۔ بعض لوگ غصہ میں کہہ جاتے ہیں کہ اب جامعہ سے ان کا رشتہ ملازمت کا رشتہ ہے اور اس میں کوئی اور جذبہ شامل نہیں ہے، بعض لوگ ایسے ہی غصے میں ثابت کرتے ہیں کہ دوسروں میں کیا کیا عیب ہیں، لیکن ان خامیوں کے ساتھ مجھے اختر صاحب مرحوم کی طبیعت کا سایہ بھی پھیلا ہوا نظر آتا ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جامعہ والوں کا جامعہ سے محبت کا رشتہ بھی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ محبت وقت کے ساتھ دلیل کی محتاج نہ رہے گی اور اختر صاحب مرحوم کی مثال ہم میں اس طرف مائل کرتی رہے گی کہ اس محبت میں وہی شان پیدا کریں جو اختر صاحب مرحوم کی محبت میں تھی۔

روش صدیقی

شعلۂ ایماں

[جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن زریں کے افتتاحیہ جلسے
میں ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پڑھی گئی۔]

شکرِ معبود کہ یہ نصف صدی بیت گئی
علم و تہذیب کے تخلیق طلب میداں میں
ہمت آبلہ پائی نے بڑا کام کیا
جذبۂ شوق کے صحرائے جنوں ساماں میں

افق افروز ہوا سوزِ دلِ شیخ الہند
ظلمتِ شب سے ہوئی صبحِ درخشاں پیدا
سینہ چاکانِ جنوں مائل تعمیر ہوئے
دشتِ ویراں میں ہوا رنگِ گلستاں پیدا

جوہرِ دا اجملؔ و ذاکرؔ کی جگر کاوی سے
خشک صحرا میں ہوئی جوئے خراماں پیدا
جلوۂ مذہب و تہذیب کی یکجائی سے
ہو چلا خواب کی تعبیر کا امکاں پیدا
جامعہ، معجزۂ خونِ جگر کی تخلیق
جیسے ظلمت میں ہو اک بامِ چراغاں پیدا

آج اس شمعِ دل افروز کے پروانوں میں
کچھ لگن بھی ہے لگاوٹ بھی ہے کچھ لاگ بھی ہے
دل میں پیوست ہے اک نشترِ خود داری بھی
وقت گاتا ہے جسے لب پہ وہی راگ بھی ہے
سوزِ پنہاں بھی ہے اور سازِ سکوت افشاں بھی
جس سے افکار پگھل جاتے ہیں وہ آگ بھی ہے
کاش اس آگ سے ہو شعلۂ ایماں پیدا

ہوسٹل اُستادوں کا مدرسہ

The Monthly JAMIA
GOLDEN JUBILEE NUMBER
Regd. :- D - 768 JAMIA NAGAR, NEW DELHI - 25 Nov. 1970
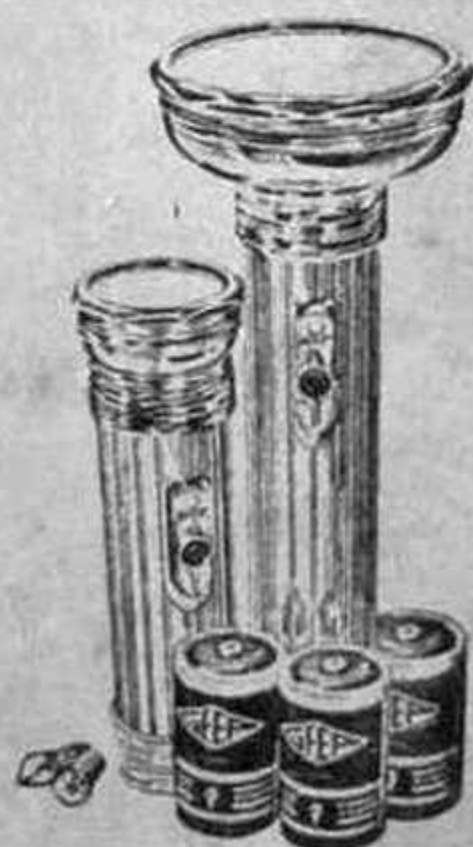
Printer & Publisher : A. L. Azmi
Printed at Union Printing Press, Delhi-6.
Title & Pictures at Dayals' Printing Press, Delhi-6.